اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ

(گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے)

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing, (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

محکمۂ فروغ وسائلِ انسانی (H.R.D.)، حکومتِ بہار سے منظور

صوبائی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت (SCERT)، پٹنہ کے تعاون سے پورے صوبۂ بہار کے لیے

© بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ

پہلی اشاعت : 2008

قیمت : Rs. 17.00

بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ، پاٹھیہ پستک بھون، بدھ مارگ، پٹنہ۔800 001 کے ذریعہ

شائع اور سن رائز پلاسٹک ورکس، پٹنہ۔800 005 میں H.P.C. کے GSM 70 (واٹر مارک)

ٹکسٹ پیپر پر کل 5000 کاپیاں چھاپی گئیں۔ Size : 24x18cm

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in), Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Engineering, Technology

اپنی بات

گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی نئے نصابِ تعلیم کے مدِ نظر بارھویں کلاس کے لیے زبان وادب کی نئی کتاب اپنے صوبے کے ہونہار طالب علموں کے لیے پیش کرتے ہوئے ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ دو سال پہلے سے ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار نے تمام زبانوں کی کتابیں بہار میں ہی تیار کرکے پیش کرنے کا جو نشانہ رکھا تھا، اس میں پچھلے سال گیارھویں جماعت کی کتابیں شائع ہوئیں اور اب بارھویں جماعت کی درسی کتاب آپ کے پیشِ نظر ہے۔ یہ کتابیں تعلیم کے جدید تصورات کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہیں۔ اس لیے ان کتابوں سے ہمارے طالب علم زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کرسکیں گے۔

جب تک ہمارا نصابِ تعلیم معیاری نہ ہوگا اور اس کے مطابق مناسب درسی کتابیں تیار نہ کر دی جائیں، اس وقت تک ہم اپنے ہونہار طالب علموں کی ضرورتوں کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کتاب ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ جس میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ اسباق کے سمجھنے میں طلبہ کو زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل ہو؛ اساتذہ کو تدریس کے دوران درسی کتاب کے ذریعے بھرپور تعاون مل سکے اور ہمارا طالب علم چلتے پھرتے زندگی کی بڑی بڑی باتیں اور علم وادب کے گہرے رموز سیکھتا جائے۔ اس کے لیے اسباق کے متن پر بھرپور تجزیاتی مشقیں شامل کی گئی ہیں تاکہ طالب علم کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔

بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ کی جانب سے میں ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار کے ڈائرکٹر، بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری) کے ڈائرکٹر (اکادمک) اور نصاب اور درسی کتاب کمیٹی کے اکادمک کوآرڈینیٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے ماہرین کا تعاون حاصل کیا جاسکا۔ میں ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار کی اورینٹل لینگویجز کمیٹی کے چیرمین کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنی نگرانی میں اردو، فارسی اور عربی کی درسی کتابیں تیار کرائیں۔

یہ کتابیں آیندہ اشاعتوں میں مزید رنگ وروغن کے ساتھ شائع کی جاسکیں گی لیکن موجودہ اشاعت میں سادگی میں پُرکاری ملاحظہ کرنے کے لیے میں اربابِ حل وعقد کو دعوت دینا چاہوں گا۔ کتاب میں کوئی فروگذاشت ہو تو اس کی اطلاع فوراً بہم پہنچائیں تاکہ بروقت اصلاح کرکے آیندہ اشاعتوں کو غلطیوں سے پاک رکھا جاسکے۔

حسنین عالم (آئی۔اے۔ایس)
مینیجنگ ڈائرکٹر، بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ، پٹنہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Engineering Technologies

گزارش

تقریباً ڈھائی برس پہلے اسٹیٹ کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔)، بہار نے اسکولی تعلیم کے لیے مبسوط نصاب تیار کرنے کی جو کوششیں شروع کیں، اس کے نتیجے کے طور پر پچھلے برس گیارھویں جماعت کے لیے زبان وادب کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں، جنھیں گذشتہ سال ہمارے طلبہ نے پڑھا اور اس کی بنیاد پر ان کے سالانہ امتحانات ہوئے۔ طلبہ، اساتذہ، سرپرستوں اور ماہرین نے ہماری پچھلی کتابوں کو نہ صرف یہ کہ سراہا بلکہ انھیں بہار کے تعلیمی نظام کے لیے ضروری اور نیک فال قرار دیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ادارے نے پہلی بار بہار کے نصاب تعلیم اور درسی کتاب کے لیے تمام تر ذمّے داریاں اپنے سر لیں۔ اردو، فارسی اور عربی کے سلسلے سے تو آج سے پہلے ہمارے ادارے میں کبھی بھی کسی کتاب کا خاکا تک نہیں بنا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں قومی سطح پر بڑے تعلیمی اداروں میں جس انداز سے کتابیں تیار کرانے کا سلسلہ رہتا ہے، ہم نے انھی خطوط پر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ قومی اور صوبائی درسیات، نصاب تعلیم اور درسی کتاب سے متعلق مختلف ورک شاپ اور مذاکروں کے دوران کتابیں تیار کرنے کے لیے مختلف مضامین کے باصلاحیت، تجربہ کار اور محنتی لوگوں کی رفتہ رفتہ ایک ٹیم بنتی چلی گئی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ہمارا تعلیمی تصوّر، نصاب اور درسی کتاب میں ڈھل کر عوام کے سامنے آیا۔

'اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ' کتاب ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے اورینٹل لینگویجز گروپ کے چیرمین اور کالج آف کامرس، پٹنہ کے صدر شعبۂ اردو، صفدر امام قادری نے طلبہ کے معیار اور تعلیمی ضرورت کو دھیان میں رکھتے ہوئے تیار کی ہے۔ ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔ مسوّدے کو آخری شکل دینے کے مرحلے میں مشتاق احمد، واحد نظیر، محمد زاہد الحق، حسن احمد، عابدہ پروین، محمد امین صاحبان نے معاونت فرمائی۔ ان تمام اصحاب کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ ہمیں توقّع ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے طلبہ کو اردو ادب کے طول وعرض کا پتا چل سکے گا۔

پچھلے سال ہمارے طلبہ نے گیارھویں جماعت کے لیے تیار شدہ درسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اب انھیں بارھویں کی نئی کتابوں کا انتظار ہے جنھیں پڑھ کر انھیں اپنے بورڈ کا امتحان دینا ہے۔ بارھویں کی کتاب بھی ہم نے اسی توجہ اور انہماک کے ساتھ تیار کرائی ہے جس طرح گذشتہ درجے کی کتاب تیار کی گئی تھی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ کتاب بھی ہمارے بچّوں کو اسی طرح پسند آئے گی جس طرح پچھلے سال کی کتاب انھیں پسند آئی تھی۔ ہم نے ہر قدم پر یہ کوشش کی ہے کہ ہماری کتابیں دل چسپ، سہل، معلومات

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

افزا اور ہر اعتبار سے کار آمد ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے موقعے پر اورینٹل لینگویجز گروپ کے چیرمین جناب صفدر امام قادری، اردو درسی کتاب کمیٹی کے کوآرڈینیٹر جناب ظفر کمالی اور معاون کوآرڈینیٹر محترمہ ترنم جہاں کے ہم خاص طور پر شکر گزار ہیں کیوں کہ انھوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ اس ذمے داری کو بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ کتاب کی تزئین اور تصحیح کے کام میں بھی ان لوگوں نے متعلقہ افراد سے تعاون لے کر ہماری پریشانیاں کم کردیں۔

نظر ثانی کمیٹی اور صلاح کار کمیٹی کے معزز اراکین کے بھی ہم شکر گزار ہیں۔ انھوں نے ہماری کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور کتاب کو مزید بہتر اور کار آمد بنانے کے لیے مشورے عنایت فرمائے۔ اسکول، کالج اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کتاب کی تیاری کے سلسلے سے متعدد ورکشاپ میں مدعو کیے جاتے رہے، ان کا اور ان کے پرنسپل صاحبان کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے۔

ہمیں اطمینان ہے کہ یہ کتاب بہار کے طلبہ کے لیے نہ صرف یہ کہ مفید ثابت ہوگی بلکہ نئے تعلیمی ماحول کی تعمیر میں بھی اس سے بھرپور مدد ملے گی۔ بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن کے اہل کار بالخصوص اس کے ایم۔ ڈی۔ جناب حسنین عالم کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن کی کوششوں سے ہماری نصابی کتاب بروقت چھپ کر منظرِ عام پر آسکی۔

آیندہ اشاعتوں میں یہ کتاب اور زیادہ کار آمد ہو سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے اپنے مفید مشورے ہم تک ارسال کرنے کی زحمت اٹھائیں۔ طلبہ اور اساتذہ سے بھی ہماری گزارش ہوگی کہ اس کتاب کے بارے میں اپنی واضح رائے دیں۔ اُن کا پیشگی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

حسن وارث

ڈائرکٹر (انچارج)

ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ بہار، (پٹنہ)

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies

کمیٹی برائے درسی کتاب (اردو)

زیرِ سرپرستی

حسن وارث، ڈائرکٹر، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

رگھوونش کمار، ڈائرکٹر (اکادمک)، بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری)، پٹنہ

زیرِ رہنمائی

سید عبدالمعین، صدر، ٹیچر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

قاسم خورشید، صدر، لینگویجز ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

ارچنا، لکچرر، ٹیچر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

اراکین، نظر ثانی کمیٹی، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

علیم اللہ حالی، سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

فاروق احمد صدیقی، ڈین ہیومنیٹیز اور صدر شعبۂ اردو، بی۔آر۔اے۔ بہار یونی ورسٹی، مظفر پور

جمشید قمر، سابق صدر شعبۂ اردو، رانچی کالج، رانچی یونی ورسٹی، رانچی

اراکین، صلاح کار کمیٹی، بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری)

وہاب اشرفی، سابق چیرمین، بہار یونی ورسٹی سروس کمیشن اور بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل، پٹنہ

فصیح الزماں، صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

اکادمک کنوینر

گیان دیو منی ترپاٹھی، کمیٹی برائے نصاب اور درسی کتاب

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

کمیٹی برائے درسی کتاب (اردو)

مولف

صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ
چیرمین، اورینٹل لینگویجز گروپ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

کوآرڈینیٹر

ظفر کمالی، شعبۂ فارسی، زیڈ۔اے۔اسلامیہ کالج، سیوان

معاون کوآرڈینیٹر

ترنم جہاں، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

اراکین

مشتاق احمد، شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ
واحد نظیر، استاد، شہید راجندر پرساد سنگھ پٹنہ ہائی اسکول، گردنی باغ، پٹنہ
محمد زاہد الحق، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
حسن احمد، لائبریرین، گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ
عابدہ پروین، استاد، ہائی اسکول، مینا پور رائی، ویشالی
محمد امین، ریسرچ اسکالر

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

چند الفاظ نئے نصاب اور درسی کتاب کے بارے میں

2005 میں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی نے ملک کے ممتاز ماہرینِ تعلیم اور دانش وروں کے تعاون سے قومی درسیات کا خاکا (NCF-2005) شائع کیا۔ پورے ملک میں اس کے ابتدائی خاکے سے جو مباحث قائم ہوئے، انھی کا یہ اثر تھا کہ ملک کے طول و عرض میں مروّجہ تعلیمی نظام میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بہار اُن صوبوں میں شامل رہا جس نے نہ صرف یہ کہ قومی درسیات کے سلسلے میں اپنے واضح نقطۂ نظر کو پیش کیا بلکہ انھی مباحث کے دوران یہ تاثر بھی اُبھرا کہ قومی سطح پر طے شدہ درسیات کے اس خاکے کو صوبۂ بہار کے مخصوص تناظر میں سو فی صد کارگر تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی بیچ یہ بات بھی سامنے آئی کہ مخصوص حالات کے پیشِ نظر بہار کی درسیات کا خاکا بھی علاحدہ طور پر تیار کیا جانا چاہیے۔ Bihar Curriculum Framework (BCF-2006) صوبۂ بہار کے تعلیمی نظام کو ایک نئے تصوّر، نقطۂ نظر اور لائحۂ عمل سے ہم آشنا کرانے کا شاید وسیلہ ثابت ہو۔

درسیات، نصاب اور درسی کتاب کے آپسی رشتوں کے بارے میں ہمارے صوبے میں زیادہ غور و فکر کی روایت نہیں تھی۔ خاکۂ نصاب تیار کر کے، کتابیں بنا لینے یا قومی سطح پر موجود درسی کتاب کو من و عن یا جزوی تحریف کے ساتھ استعمال میں لانے کا انداز گذشتہ دو دہائیوں سے قائم رہا ہے لیکن پچھلے سال پُرانے طرزِ عمل کو چھوڑتے ہوئے نئے نشانات مقرّر کیے گئے۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے NCF-2005 کی روشنی میں جس گفتگو کا آغاز ہوا، اُسے BCF-2006 اور این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے نصاب اور بہار کے گذشتہ نصاب اور بہار ٹکسٹ بک اور این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کی کتابوں کا موازنہ کیا گیا اور یہ جانچنے کی بھی کوشش کی گئی کہ نصاب کا کتنا حصّہ درسی کتاب میں شامل ہو سکا اور غفلت پسندی میں کتنا چھوٹ گیا۔ اس طرح تقریباً ایک برس کی میرا تھن سرگرمی کے بعد ہم بہار کے لیے ایک نیا نصابِ تعلیم تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تعلیم سے متعلق دنیا میں جو نئے سوالات یا چیلنجز ہمارے سامنے ہیں، اُن کو دیوار پر لکھی عبارت کی طرح ہم نے سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنایا۔ ابتدائی درجات سے لے کر درجۂ دوازدہم تک ہمارا طالب علم کس طرح زینہ بہ زینہ اگلی منزلوں کی طرف بڑھتا جائے گا، اس کا واضح خاکا، نصاب تیار کرتے ہوئے ہماری نگاہ میں تھا۔ ہر سطح سے آگے بڑھتے ہوئے بچّہ کیا سیکھتا جائے گا جس سے اُسے ایک ذمّے دار اور موثر شہری بننے میں مدد ملے، اس کا بھی ہم نے دھیان رکھا۔ بچّوں پر نظامِ تعلیم اور

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

کتابوں کا غیر ضروری بوجھ نہ لد جائے، اس کے تئیں بھی ہم نے غفلت نہیں برتی۔ ان تمام امور پر بیدار رہتے ہوئے ہم نے اپنا نصاب تیار کیا۔

جہاں تک زبان وادب کی تعلیم کا سوال ہے، اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ مادری زبان تو وہ پونجی ہے جس کے بغیر بچے کا وجود تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کئی دوسری زبانیں اور بولیاں بہار جیسے کثیر لسانی معاشرے میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ایک بچے کو اُن تمام زبانوں اور بولیوں میں سے مقدور بھر سیکھنے کی ضرورت ہوگی۔ زبانیں ماحول سے بچے کے اندر داخل ہوتی ہیں اور نصابی کتاب تک پہنچنے سے پہلے ہی سیکڑوں الفاظ اور جملوں سے وہ واقف ہو چکا ہوتا ہے۔ زبانوں کی مدد سے ہی وہ دوسرے مضامین کی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ NCF-2005 نے خاص طور پر کثیر لسانی معاشرے کی پہچان کی اور ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی طاقت کو نصاب کا حصہ بنانے کی وکالت کی۔ صوبۂ بہار بھی بولیوں اور زبانوں کی اس زرخیزی کی بہترین تجربہ گاہ ہے جس کی وجہ سے نصاب تعلیم میں مختلف علاقائی، قومی اور بین الاقوامی زبانوں سے طلبہ کو روشناس کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح ہماری یہ کوشش رہی کہ یہ نصاب بہار کی مخصوص ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہوئے نہ صرف قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو بلکہ اس کے دروازے اور کھڑکیاں بین الاقوامی فصیلوں کی طرف بھی کھلیں۔

اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے نصاب تعلیم کی ہماری مشترکہ ذمے داری تھی۔ ہندستانی معاشرے کے لیے اردو ایک زندہ اور روزانہ کام آنے والی زبان ہے جسے مادری زبان/پہلی زبان کے طور پر لاکھوں طالب علم اپناتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبانیں ہر چند ہمارے معاشرے میں دوسری، تیسری اور چوتھی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں پھر بھی اُن کی شدید ضرورت کے دو واضح اسباب ہیں۔ دونوں زبانیں کلاسیکی اہمیت کی حامل ہیں اور اُن کا وقیع ادبی سرمایہ نہایت کارآمد ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں عالمی سطح پر بہترین معاشی وسائل فراہم کرتی ہیں۔ کلاسیکی ہونے کے باوجود یہ زبانیں زندہ اور متحرک ہیں۔ اس لیے ان دونوں زبانوں کے نصاب تعلیم اور درسی کتاب تیار کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ چھٹی جماعت سے انھیں پڑھنے کے باوجود بارھویں درجے تک پہنچ کر بچہ اتنی صلاحیت پیدا کرلے کہ وہ ان زبانوں میں کاروباری ضرورتیں پوری کرسکے۔

اردو مادری زبان ہے اور طلبہ کو درجۂ اوّل سے اس کا مطالعہ کرنا ہے، اس لیے اس زبان کے نصاب کی تیاری میں دوسرے اصول کارفرما رہے۔ مادری زبان سیکھنے کے وسائل نصابی کتاب اور کلاس روم کے علاوہ کئی اور بھی ہیں۔ دوسری زبانوں کے مقابلے اس کے سیکھنے کی رفتار تیز ہوگی۔ بچہ نصابی کتاب کے باہر سے بھی بہت کچھ نیا سیکھتا جاتا ہے۔ اس لیے مادری زبان کے نصاب کی تیاری میں ہمارے سامنے یہ چنوتی بھی ہوتی ہے کہ آخر پورے سال تواتر کے ساتھ اس نصاب کو کیسے پڑھایا جائے؟

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ کیوں.....؟

صوبۂ بہار کے لیے نئے نصابِ تعلیم کو تیار کرتے ہوئے یہ موضوع بار بار اراکین کے ذہن میں سوال کی طرح ابھرتا رہا کہ کیا اپنی زبان وادب کی تاریخ پڑھائے بغیر ہم بچّوں کے ادبی ذوق کی مناسب تربیت کر سکتے ہیں؟ یہ صرف اردو سے ہی متعلق نہیں تھا بلکہ تمام زبان وادب کے لیے یکساں طور پر غور وفکر کی بات تھی۔ نصاب اور درسی کتاب کمیٹی کے اکادمک کنوینر جناب گیان دیو منی ترپاٹھی تو ہمیشہ یہ سوال اٹھاتے رہے کہ کیا زبانوں کے ارتقا کی تاریخ قصّے اور کہانی کی طرح، ہم بچّوں کو نہیں پڑھا سکتے؟ شاید یہی وجہ تھی کہ گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے مشترکہ طور پر تمام زبانوں میں تاریخِ زبان وادب کی ایک علاحدہ لیکن مختصر کتاب شاملِ نصاب کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہ سوال اساتذۂ کرام اور طلبہ دونوں کے ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر تاریخِ ادب پڑھانا کہیں اضافی تعلیمی بوجھ تو نہیں؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ بات لازمی طور پر ہونی چاہیے کہ ہمارے بچّے درسی کتاب پڑھتے ہوئے تاریخِ زبان وادب کی بہت ساری بنیادی باتیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ مختلف اصناف کی مختصر تاریخ اور شاعروں، ادیبوں کے حالاتِ زندگی سے متعلق معلومات کیا تاریخِ ادب سے الگ کوئی چیز ہیں؟ ایسے مختصر نوشتے نویں جماعت سے ہی بچّوں کے مطالعے میں آنے لگتے ہیں۔ اس لیے جب تاریخِ ادب کی وہ مکمل لیکن مختصر کتاب کا مطالعہ کریں گے تو اُن کے لیے سب کچھ انجانا نہیں ہوگا۔ بلکہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں جن باتوں کو گذشتہ تین چار برسوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان کو ایک مرتّب شکل میں تاریخِ ادب کے عنوان سے یکجا صورت میں مطالعہ کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس میں طالب علم کو بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کر کے، خود کو تر و تازہ کر لینا ہے۔

تاریخِ زبان وادب کی تدریس کے مقاصد بالکل واضح ہیں۔ جس طرح ہم اپنے اطراف و جوانب اور اسلاف کے بارے میں معلومات حاصل کر کے خوش ہوتے ہیں، اسی طرح اپنی زبان کی تاریخ پڑھتے ہوئے اصل میں اپنے ادبی خاندان کے بچھڑے اور بھولے بسرے لوگوں سے ملاقات کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں۔ اس آشنائی سے خلوص اور اپنائیت بڑھتی ہے۔ جہاں تک اردو کی ادبی تاریخ کا سوال ہے، ہم اپنے طالبِ علم کو یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ آپ جسے اپنی مادری زبان تسلیم کرتے ہیں، وہ ہمیشہ سے اسی شکل میں نہیں ہے جس شکل میں آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ زبان مختلف مقامات اور ادوار کا سفر کرتی ہوئی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

ہم تک پہنچی ہے۔ یہ ایک دن کی کہانی نہیں ہے۔ کم از کم ایک ہزار برس بیت گئے، جب ہماری زبان نے تشکیل کے سلسلے میں قدم بڑھایا۔ ایک ایک قدم بڑھنے اور ترقی کے مراحل طے کرنے میں جو ہزار برس بیتے، اس میں ہمارے ملک اور قوم کی زندگی میں بہت ساری اُتھل پتھل اور عروج و زوال کے واقعات چھپے رہے۔ نہ جانے کتنے اندھیرے اور اجالے اس دوران ہماری زبان کے حوالے سے پیدا ہوئے اور اس کے دوررس نتائج بھی سامنے آئے۔

سچی بات تو یہی ہے کہ تاریخِ ادب کا مطالعہ اپنی زبان، اپنے ملک اور اپنی قوم کے نشیب و فراز کے ظاہری اعداد و شمار ہی جمع کرنا نہیں بلکہ داخل کی سطح پر زبان، ملک اور قوم میں تعمیر و تخریب کا کیسا گھمسان مچا تھا، اسے بھی درج کرنا ادب کے تاریخ نویس کے لیے ایک ضروری کام ہے۔ اسی لیے جب ہم تاریخِ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تہذیب و تمدن اور ثقافت کے بدلتے منظروں کو بھی اپنی آنکھوں میں سمیٹتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ غور کرنے پر یہ پتا چلتا ہے کہ تاریخِ ادب کی معلومات کے دائرے میں ہی عمومی تاریخ، ادیبوں اور شاعروں کے احوال، سیاست کے بدلتے رنگ، سماجی ارتقا کے بدلتے مختلف پڑاو سب ایک ساتھ ہمارے مطالعے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ سماج کے ایک منچ پر جو تبدیلی آتی ہے، اس کے لازمی اثرات دوسری جگہ پر بھی ہوتے ہیں ادب ان تبدیلیوں اور آویزشوں کی مستند ترجمانی بھی ہے۔ اس لیے ادبی تاریخ کا دائرہ کار بہت پھیل جاتا ہے۔ آخر کوئی توجہ ہوگی کہ تاریخِ ادب اردو سے متعلق کتابوں کے صفحات کی تعداد اکثر ہزاروں میں ہوتی ہے۔

ہم نے اپنے ہونہار طلبہ کے لیے اپنی زبان کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تیار کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گلدستہ گلستاں نہیں ہوتا لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ باغ کے سب سے اچھے پھولوں کا مجموعہ ہی گلدستہ ہے۔ اسے باغ کی نمایندگی کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں یہ پتا ہے کہ اختصار کی وجہ سے اردو ادب کی ہزاروں خوشبوئیں اور روشنیاں ہمارے طلبہ تک صراحت کے ساتھ نہیں پہنچ پائیں گی لیکن اشارے میں شاید ہم ہی سہی، اپنی مادری زبان کے ارتقا کی ضروری باتیں بتانے میں کامیاب ہیں۔ روم ایک دن میں نہیں بن گیا تھا، اسی طرح ہماری زبان بھی ایک دن میں اس طرح سے کھڑی نہیں ہو سکی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اس بات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں کہ ان کی زبان بھی بہت سارے لوگوں کی کوششوں اور جدّ و جہد کے بعد آج اس شکل میں سامنے آسکی ہے۔ پچھلے زمانے کی کہانی کی چھوٹی چھوٹی گتھیوں کو سلجھانا معلومات کے نئے خزینوں تک پہنچنا ہے۔ یہ سلسلہ اپنی زبان کی ایک جادوئی دنیا کی سیر بھی ہے۔ ارتقا کے کس موڑ پر ایک چھوٹی سی بات انقلاب آفریں تبدیلیوں کا اشارہ بن گئی اور کتنے بڑے لکھنے والے کسی خاص وجہ سے وقت کی گرد کی نذر ہو گئے، ان کی تفصیل کے لئے تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ ایک ناگزیر عمل ہے۔

تاریخِ ادب کی تدریس سے ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارا طالب علم اپنی مادری زبان کی تاریخ سے جذباتی طور پر اس طرح جڑ جائے جس سے آنے والے وقت میں، چاہے وہ جس علمی شعبے کا رُخ کرے لیکن اپنی زبان سے اس کی جذباتی وابستگی ہر حال میں قائم رہے۔ اس کا ایک لازمی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ کسی بھی ثقافتی یا لسانی حلقے میں پہنچے، وہ اپنی جڑوں سے جُڑا ہوا ہوگا۔ اسے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اردو زبان کی پیدائش :
نظریات اور حقائق کا جائزہ

اردو کی ابتدا کس جگہ ہوئی، وہاں کون سی آبادیاں موجود تھیں اور ان کی گذشتہ بولیاں کیا تھیں، اردو کے طالب علم، اساتذہ اور محققین کے پاس ان سوالوں کے حتمی جواب موجود نہیں۔ ماہرین نے جو جواب فراہم کیے، ان کے بطن سے کئی نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر ماہرینِ لسانیات دوسروں کے نتائج سے اختلاف کرتے ہیں اور اپنے فیصلے کو "آخری" قرار دیتے ہیں۔ اس وجہ سے اردو زبان و ادب کے ایک عام طالب علم کو اردو کی ابتدا کے سلسلے سے کسی نتیجے تک پہنچنے میں اضافی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماہرین کے درمیان اتفاقِ رائے نہیں ہونے کی ایک وجہ علمی اور اصولی ہے لیکن بنیادی مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کیوں کہ دورِ آغاز کے تقریباً تین سو برسوں کے تعلق سے اصل ادبی دستاویزات دستیاب نہیں۔ ان کی عدم فراہمی سے بھی عام لوگوں کے ساتھ ساتھ، ماہرینِ لسانیات کو بھی قیاس کے گھوڑے دوڑانے کی مجبوری یا سہولت حاصل ہو گئی جس کے نتیجے میں اردو کی ابتدا اور آغاز کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے میں انتشار کی صورتِ حال عام ہے۔

اردو کی سب سے پہلی کڑی کے طور پر ہم امیر خسرو کے ہندوی کلام کو دیکھتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف سے چودھویں صدی عیسوی کے ربعِ اوّل کا یہ ادبی سرمایہ اردو کی ابتدا کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہو سکتا تھا لیکن خسرو کا ہندوی کلام امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا اور اس میں الحاقی کلام اتنی مقدار میں شامل ہو گیا کہ کون اصل ہے اور کون نقل، اس کا امتیاز کرنا ممکن نہیں۔ محتاط روّیہ یہ ہونا چاہیے کہ امیر خسرو کے نام سے موجود ہندوی ذخیرے کو اُن کا اصلی کلام کسی بھی طور پر تھوپ نہ کیا جائے۔ حالاں کہ یہ سچائی ہے کہ انھوں نے ہندوی میں لکھا۔ تخلیقی اظہار کے لیے ایک بنتی ہوئی مقامی زبان کو سر آنکھوں پہ بٹھایا لیکن یہ سوال بھی اہم ہے کہ اپنے عہد میں کیا صرف امیر خسرو ہی تھے جو ہندوی کو اپنے ادبی اظہار کا وسیلہ بنا رہے تھے؟ ہرگز نہیں۔ خسرو نے اپنے سابقین میں مسعود سعد سلمان کا نام لیا ہے۔ اُن کے زمانے میں یقیناً دوسرے لوگ بھی ہوں گے جو اس نئی اور بنتی ہوئی زبان میں ادبی تخلیقات پیش کر رہے ہوں گے۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ان لوگوں کی ایک بھی ادبی تحریر اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہ سکی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ زبان اپنے تشکیلی مراحل مکمل کر لینے کے بعد ہی ادبی اظہار کی قدرت حاصل کرتی ہے۔ اس لیے تیرھویں صدی کے نصف سے سو، دو سو برس پہلے اس زبان کے بننے کا عمل شروع ہو چکا تھا، ایسا نتیجہ اخذ کرنا نامناسب نہیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

خسرو نے "نہہ سپہر" میں ہندستان کی 12 بولیوں کا ذکر کیا ہے، اسی میں "زبانِ دہلی و پیرامنش" ہے۔ مسعود حسین خاں، امیر خسرو کے اسی بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا کے مسائل اس وقت تک نہیں حل کیے جا سکتے جب تک دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں پر غور نہ کر لیا جائے لیکن اردو کی پہلی مستند کتاب "مثنوی کدم راو پدم راو" کی شکل میں دکن میں ملتی ہے جس کا سنہ تصنیف 35-1421 کے دوران تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کتاب سے تقریباً ایک صدی پہلے امیر خسرو گزر چکے ہیں اور اُن سے اگر دو سو برس قبل اردو کا بیولا تیار ہونا شروع ہو چکا تھا، تب اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی تاریخ کے اوّلین تین سو برس ایک گمشدہ باب ہیں۔ اس دوران اردو کے اہلِ قلم اور دیگر اصحاب نے کون کون سے کارہائے نمایاں انجام دیے، اس کی کسے خبر ہے؟ جب تک اس زمانے کی ادبی تحریریں حاصل نہیں ہو جاتیں، اردو کے آغاز وارتقا کی بحث حتمی انداز میں نہیں کی جا سکتی۔

بارھویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی تک بھکتی تحریک کے زیرِ اثر جس نئی زبان کا فروغ ہوا اور جس کے نمونے بہار سے گجرات اور پنجاب سے دکن تک پھیلے ہوئے ہیں، اتفاق سے اس کی کڑیاں اردو کی ابتدا سے متعلق گفتگو میں جوڑی نہیں جا سکیں۔ اس دوران مسلمان صوفی اور ہندو بھگت نہ صرف مذہب اور سماجی اصلاح کے معاملات میں دخل رکھتے تھے بلکہ فنونِ لطیفہ کی مختلف شاخوں میں اپنی خدمات سے ایک بالکل نئی صورت پیدا کر رہے تھے۔ ادب و شاعری، موسیقی اور تعلیم کا فریضہ یہ اصحاب کچھ اسی انداز سے اُس زمانے میں ادا کر رہے تھے۔ اس کی روشنی اور چمک دور دراز تک بڑھتی جا رہی تھی لیکن اردو کے آغاز وارتقا کے ماہرین نے اس دوران کے پانچ سو برسوں کے ادبی اور علمی سرمائے سے سرسری گزر جانے کی حکمت عملی اپنائی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے جن صوفیوں کے کلام پر خال خال غور کیا گیا، وہاں بھی عجلت کی فراوانی ہے۔ ابتدائی نمونوں میں غیر ضروری انتخاب کا رویہ بھی ہمیں بھکتی تحریک کے ادبی سرمائے سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔

آج اردو کی ابتدا سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ہمارے ماخذات صرف اور صرف دکن کی ادبی تصنیفات ہیں۔ اُن میں بھی سترہویں صدی عیسوی کی سب سے زیادہ۔ محمود شیرانی اور مسعود حسین خاں جیسے اس موضوع کے ماہرین کی دسترس میں بھی اسی زمانے کا کلام ہے جس کی مثالوں سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اب یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم یہ ضرور بتاتے ہیں کہ اردو کی پیدائش دکن میں نہیں ہوئی اور وہ شمال سے ایک بنی ہوئی زبان کے طور پر محمد بن تغلق کی افواج کے ساتھ دکن پہنچی ہے لیکن جب ابتدائی زبان کی مثال کا موقع آئے گا تو ہمارے سامنے فخر دین نظامی سے لے کر ملا وجہی کی کتابیں ہوتی ہیں جو نہ صرف دکن میں لکھی گئیں بلکہ ان کے مصنفین بھی اسی علاقے سے آتے تھے۔ اس وجہ سے ہماری مجبوری مزید بڑھتی ہے اور اردو کی ابتدا سے متعلق ہمارے نتائج حقائق کی طرف لے جانے کے بجائے ہمیں الجھا دیتے ہیں۔

اردو کس خطّے کی زبان ہے اور کن لوگوں نے اسے پالا بڑھایا، اس پر غور و فکر کا کام کافی پہلے شروع ہوا۔ امیر خسرو نے بھی اگر اسے یا اسی طرح کی کسی زبان کو "زبانِ دہلی" کہا تو اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس نئی زبان کو وہ دوسری زبانوں سے الگ پہچاننا چاہتے تھے۔ کافی زمانے کے بعد میر امّن نے "باغ و بہار" میں اردو کی پیدائش اور مولد و مسکن پر غور کرتے ہوئے اردو کو مسلمان حملہ آوروں اور مقامی ہندوؤں کے اشتراک سے بنی زبان قرار دیا ہے۔ ایک زمانے تک میر امّن کا یہ نظریہ کافی مقبول تھا

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اور مختلف لوگوں نے اسی کا اتباع کیا۔ انشاءاللہ خاں انشا (دریائے لطافت) اور امام بخش صہبائی (قواعد اردو) کے ہاں اس ''ملواں'' زبان کے نظریے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اردو زبان کی پہلی تاریخ ''آب حیات'' لکھتے ہوئے اپنا مشہور مشاہدہ درج کیا: ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے''۔ محمد حسین آزاد بھی کہیں نہ کہیں میر امن کے اثر میں ہیں اور مغلوں کے زمانے میں آگرہ کی مرکزیت اور وہاں کی ترقی یافتہ ہونے کو بنیاد بناتے ہیں۔

اردو کی ابتدا سے متعلق گفتگو میں سید سلیمان ندوی کی رائے کو بھی خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔ اپنی کتاب ''نقوشِ سلیمانی'' میں اردو کی پیدائش کا مقام وہ سندھ کو قرار دیتے ہیں۔ انھیں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ اپنے مفروضے کو تاریخی اور لسانی بنیادوں پر ثابت کر سکیں۔ انھوں نے اردو کے سرمایۂ الفاظ میں عربی اور فارسی عناصر کی موجودگی کی وجہ سے سندھ کے ہند اسلامی اختلاط کو مرکز میں رکھا اور اردو کا اسے مولد قرار دیا۔ سید سلیمان ندوی کی باتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''دکن میں اردو'' کے مصنف نے یہ تاریخی حقیقت پیش کی کہ فتح سندھ سے بہت پہلے علاقۂ دکن میں عرب مسلمانوں کی آمد اور مقامی آبادی سے ربط کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ اس لیے اردو کا مولد دکن قرار دیا جانا چاہیے۔ نصیر الدین ہاشمی کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ پندرھویں صدی سے سترہویں صدی کے دوران دکن میں اردو کا بول بالا تھا۔

پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی کو مرکز میں رکھ کر اردو کی ابتدا سے متعلق تحقیق ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ بعض لوگوں نے درمیانی راہ اختیار کی۔ پنڈت کیفی نے اپنی کتاب ''کیفیہ'' (1942) میں دہلی اور پنجاب کے جھگڑوں سے دامن بچاتے ہوئے لاہور سے دہلی تک کی قدیم زبان کو ایک ہی زبان مان لیا۔ تقریباً یہی بات بعض مثالوں کے ساتھ سنیتی کمار چٹرجی نے ''انڈو آرین اینڈ ہندی'' میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ٹی۔ گراہم بیلی نے اپنا جھکاو پنجاب کی طرف رکھا ہے۔ جارج گریرسن ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' میں اردو کی اساس ''ورناکولر ہندستانی'' کو قرار دیتے ہیں۔ یہ بالائی دوآبہ اور روہیل کھنڈ کی بولی ہے۔ ژول بلاک اردو کی ابتدا کے اسباب و عوامل پر غور کرنے کے مرحلے میں ہریانوی کو اہم مانتے ہیں اور اس کی چھان بین کا مشورہ دیتے ہیں۔

اردو کی ابتدا کہاں ہوئی، اس پر ایک عرصہ تک حافظ محمود شیرانی کی رائے پر انحصار کیا جاتا رہا۔ انھوں نے 1928 میں شائع شدہ اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں لسانی اور تاریخی دونوں حوالوں سے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا ہے کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی اور اردو کی ابتدائی تخلیقات پر پنجاب کے گہرے اثرات رہے ہیں۔ محمود شیرانی کو یہ سہولت حاصل تھی کہ قدیم پنجاب اور قدیم اردو کا موازنہ کر کے کوئی فیصلہ کر سکیں۔ انھوں نے سرمایۂ الفاظ، صرف و نحو اور تاریخ وارتقا کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے نقطۂ نظر کو استحکام بخشا۔ انھوں نے بڑے پیمانے پر غیر مطبوعہ کتابوں، مخطوطات میں موجود اردو کے ابتدائی سرمائے کو بھی نشانِ راہ بنایا۔ 1928 کے بعد سے ہندستان کی آزادی اور تقسیم تک اردو کی ابتدا سے متعلق محمود شیرانی کے نظریۂ پنجاب کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔

لیکن 1948 میں جب مسعود حسین خاں کی کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' شائع ہوئی، اس وقت سے محمود شیرانی کے نظریے کے تسامحات پر غور کیا جانے لگا۔ محمود شیرانی کے خلاف مسعود حسین خاں نے جو سب سے بڑی فردِ جرم عاید کی، وہ یہ تھی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

کہ شیرانی پنجابی کی جن خصوصیات کو بنیاد بناتے ہیں، وہ سب کی سب ہریانوی میں موجود ہیں۔ ان کا مشہور جملہ ہے: ''قدیم اردو کا پنجابی پن اس کا ہریانی پن بھی ہے۔'' مسعود صاحب اردو کی پیدائش کے سلسلے سے امیر خسرو کی اصطلاح، برج اور میواتی کو اردو کی اساس مانتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ مختلف عہد میں ان بولیوں نے اردو پر الگ الگ اثرات ڈالے ہیں لیکن قدیم اردو پر سب سے زیادہ اثر ہریانوی کا ہی ہے۔ چوں کہ مسعود حسین خاں پنجابی کی امتیازی خصوصیت ہریانوی سے بھی جوڑ دیتے ہیں، اس لیے ان کے نظریے کی اساس پانچ زبانوں پر قائم ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے یہ نظریہ زیادہ مقبول ہوا۔

مسعود حسین خاں نے ہریانوی پر زیادہ زور دیا۔ محی الدین قادری زور نے یہ اختلاف کیا کہ ہریانوی اردو کے بعد کی زبان ہے اور جو لسانی اشتراک اردو اور ہریانوی میں موجود ہیں، ان کی وجہ جغرافیائی قربت کے ساتھ ساتھ زمانی قربت بھی ہے۔ زور صاحب نے مسعود حسین خاں کے نتائج کو جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ تسلیم کیا ہے۔ لاہوری اور دہلوی زبانوں کی گتھی جو امیر خسرو کے بیان کی وجہ سے الجھی ہوئی ہے، اس پر مسعود حسین خاں کے تجزیے کے برخلاف محی الدین قادری زور نے اپنے نتائج پیش کیے ہیں۔ زور صاحب نے اپنی کتاب ''ہندستانی لسانیات'' میں اردو کی ابتدا کے تعلق سے پنجابی اور ہریانوی دونوں زبانوں کی طرف لپک دکھائی تھی لیکن 1960 کے بعد اپنے ایک مضمون ''اردو کی ابتدا'' میں وہ ہریانوی کے دعوے کو مسترد کرتے ہیں۔ وہ پورے طور پر نظریہ پنجاب کو بھی اس مضمون میں اہمیت نہیں دیتے۔

کسی بھی زبان کی ابتدا کی تاریخ اور مقام کے حتمی تعین کی کوشش اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ زبان پایۂ اعتبار تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔ اس دوران کئی صدیاں گزر چکی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ہزاروں سال کا سفر مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے دستاویزات کی عدم دستیابی کے علاوہ مختلف سماجی اور سیاسی عوامل بھی اس گفتگو کا حصہ بنتے ہیں۔ لسانیات کے طالب علم کو سماج اور سیاست کے اس لین دین پر ہوش مندانہ نگاہ رکھنی چاہیے۔ ایک طویل مدت تک اردو کی ابتدا سے متعلق نظریات میں جو خلفشار رہا، اس کے پیچھے سیاست اور سماج کے رشتوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محمود شیرانی جب اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' لکھ رہے تھے، اس زمانے میں ہندستانی سیاست میں پنجاب کی مرکزیت قائم ہو چکی تھی۔ تعلیم، زراعت، افواج سے لے کر حسن وصحت جیسے تمام معاملات میں اہل پنجاب کو فوقیت حاصل تھی۔ مسلم لیگ، کانگریس، آریہ سماج اور انقلاب پسندی: ان تمام منچوں پر پنجاب کے ہندو اور مسلمان اپنا زبردست اثر رکھتے تھے۔ عین ممکن ہے، اسی مرحلے میں اردو کی پیدائش کی سراغ رسانی میں اپنے گھر آنگن کی اہمیت زیادہ روشن ہو گئی ہو حالاں کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محمود شیرانی خود راجستھان کے ٹونک سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی طرح مسعود حسین خاں اردو کی پیدائش کے لیے جب مقام کا تعین کرتے ہیں، اس وقت ہندستان کی تقسیم ہو چکی ہے۔ دہلی ایک اجڑی اور برباد شکل میں اپنے باشندوں کا منہ چڑھا رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تقسیم کے بعد اہل دہلی کو بھولی بسری اردو کا خیال آئے اور پھر اس کی ابتدا کے سرے جوڑے جائیں۔ مسعود حسین خاں کے انداز گفتگو میں جو قطعیت ہے، وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اردو کے مولد کے طور پر دہلی سے اِدھر اُدھر نہیں جاسکتے۔ محمود شیرانی کے نظریے کی جس

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies

شدّت سے مخالفت کی گئی ہے، اُس کے پیچھے بھی یہی سماجی اور سیاسی مجبوری ہے اور فضیلت کا تاج پنجاب سے اتار کر دہلی کے سر ڈالنا ہے۔ اسی وجہ سے محمود شیرانی اور مسعود حسین خاں صاحبان کے ہاں بعض اوقات اپنے علمی موقف پر بے جا اصرار دکھائی دیتا ہے۔ تحقیق کے طالب علم کو غور و فکر کے مرحلے میں ان امور سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ موجودہ دور میں ایک مخصوص سیاسی جماعت جس طرح تاریخ، تہذیب اور شعر و ادب کو اپنے سیاسی آئینے سے پہچاننے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہی ہے اور حقائق کو بدلنے میں کامیابی کے خواب دیکھ رہی ہے، اسی طرح گذشتہ زمانے میں اردو کی ابتدا سے متعلق جو شدّت بیانی بعض سیاسی اسباب سے ہوئی، دونوں کو ایک ہی آئینے میں دیکھنے کی میں سفارش کرنا چاہتا ہوں۔

مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' کی مختلف اشاعتوں میں کافی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان کی رایوں میں بھی جزوی تبدیلی آئی ہے لیکن اب بھی ان کا سب سے زیادہ زور ہریانوی پر قائم ہے۔ نصف صدی کی مدّت میں اس موضوع پر اُن کے کئی مضامین آئے۔ 1972 میں شائع شدہ ان کے مضمون "Some Observations on the Origin of Urdu" میں قدیم اردو کی اصل کھڑی بولی کو مانا ہے۔ سہیل بخاری نے بھی اردو اور کھڑی بولی کے رشتے کی وضاحت کی ہے۔ بعد کے زمانے میں گیان چند جین نے بھی ان اصحاب کی ہم نوائی کی۔ مرزا خلیل بیگ اور لسانیات کے حلقے میں شامل تازہ واردان رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے نظریے سے متفق ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں عام طور پر اردو کو کھڑی بولی سے برآمد شدہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کی اصل کھڑی بولی ہے، یہ نظریہ اب خاصا مقبول ہو چکا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پنجابی اور ہریانوی کی اردو کی ابتدا سے متعلق گفتگو میں اہمیت ختم ہو گئی یا ان زبانوں سے متعلق مطالبات کی ضرورت نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ محمود شیرانی اور مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا سے متعلق غور و فکر کا جو زاویہ اور تحقیقی ادراک عطا کیا، اسی سے فائدہ اٹھا کر جدید ماہرین لسانیات نے کھڑی بولی تک کا سفر طے کیا ہے۔ آنے والے دور میں یہ سلسلہ اور آگے جائے گا۔ شوکت سبزواری اردو کی ابتدا کے لیے پالی اور انصار اللہ پوربی زبانوں کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یہ بعید از قیاس نہیں کہ آنے والے دور میں اردو کے ماہرین لسانیات تحقیق کی ان نئی وادیوں تک پہنچیں۔ خاص طور سے بھکتی تحریک سے متعلق ادب پر غور و فکر کرتے ہوئے پورب کی کئی بولیوں پر توجہ دینی پڑ سکتی ہے۔ ہمیں مستقبل کے محقق اور اس کے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

مختصر گفتگو

۱۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام غیر مستند کیوں ہے؟
۲۔ ماہرینِ زبان کو بھکتی تحریک کے زیر اثر پیدا شدہ ادب پر توجہ کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟
۳۔ ''اردو کی جائے پیدائش سندھ ہے''۔ اس قول کی صداقت کو پرکھیے۔
۴۔ زبان کی پیدائش پر غور کرتے وقت کون سے مسائل سامنے آتے ہیں؟ بتائیں۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ اردو کی ابتدا کے متعلق سب سے معتبر نظریہ کون سا ہے؟ مدلل تحریر کیجیے۔
۲۔ مسعود حسین خاں کا نظریہ محمود شیرانی کے نظریے سے کن بنیادوں پر مختلف ہے؟ مسعود حسین خاں کے نظریے کی خامیوں کو قلم بند کریں۔
۳۔ 'کھڑی بولی' اردو کی ماں ہے۔ اس نظریے سے قبل کن کن زبانوں اور بولیوں کو ''ام الاردو'' قرار دیا گیا' تفصیل سے لکھیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اردو کا تہذیبی مزاج

اردو کی پیدائش میں مختلف لسانی، سماجی اور تہذیبی حلقوں کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ماہرینِ لسانیات نے اپنی تحقیقات سے ان مسائل کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جن کی بنیاد پر کبھی کبھی یہ سوال اٹھتا تھا کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ جدید لسانیات نے ایسے ذرائع بھی آسان کر دیے جن کی مدد لے کر اردو زبان کے جسم و جان کے اجزا کی چھان بین ممکن ہے۔ صوتیات، سرمایۂ الفاظ اور صرف و نحو کی بنیاد پر بھی اردو کی تہذیبی جڑوں کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ آج اردو کے پاس ایک ہزار سال کی تاریخ اور تقریباً چھے سو برسوں کا مستند ادبی سرمایہ موجود ہے جن کو بنیاد بنا کر اس زبان کے تاریخی اور تہذیبی انسلاکات بہ آسانی طے کیے جا سکتے ہیں۔

اردو کی پیدائش اور نشو و نما کی ابتدائی کڑیوں پر غور کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندستانی، ایرانی اور عربی نسل کے لوگوں کے بیچ یہ زبان بن رہی تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے علاوہ ہندستان کے لسانی منظر نامے پر جب غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شمال مغرب سے دہلی تک خاص طور پر شورسینی اَپ بھرنش کا قبضہ تھا۔ گریرسن نے مغربی ہندی کے نام سے جن بولیوں کو پہچانا، وہ سب کی سب شورسینی اَپ بھرنش کی زائیدہ ہیں۔ اس لیے کھلے ذہن سے اردو کی پیدائش کے تعلق سے جغرافیائی اعتبار سے دہلی سے سندھ تک اور ایران و عرب تک ایک طائرانہ نظر ڈال لینا چاہیے۔

دنیا کی کم زبانیں ایسی ملیں گی جن کی تہذیبی آبادیاں اتنی کثیر اللسان ہوں۔ ثقافتی اعتبار سے بھی ان کے درمیان بہت فرق ہے۔ کہنا چاہیے کہ سفید و سیاہ کا امتیاز بھی اس میں پنہاں ہے۔ ایک خود کو زبان داں مانتا ہے اور دنیا کی تمام آبادی کو گونگی کہتا ہے۔ ایک خدائے یکتا کی پرستش کرتا ہے، دوسرا اپنے لامحدود خداؤں کا اسیر ہے۔ ایک نے اپنے مذہب والوں پر علم کا حاصل کرنا فرض کر رکھا ہے اور دوسرے نے مستورات اور کمزور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی مذہبی ہدایت دے رکھی ہے۔ جو ایک خدا کو ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی ایک زمانے میں اپنے عبادت خانے میں تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے۔

تہذیبی اعتبار سے اردو کی پیدائش کے مضمرات حتمی طور پر طے کرنے میں ایک عام آدمی کو اچھی خاصی مشکلات سے اس لیے گزرنا پڑتا ہے کیوں کہ تہذیب و ثقافت کے مختلف اور متضاد آئینوں میں اردو کی شکل و شباہت پہچاننا آسان نہیں ہے لیکن اردو کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس بات پر مرتکز کر دیتا ہے کہ اردو کو کثیر ثقافتی، کثیر مذہبی اور کثیر لسانی بنیادوں کے ساتھ پہچانا جائے۔ یہیں اس زبان کی اُس خوبی کا بھی پتا چلتا ہے جس نے اِس ملک کی تہذیبی شیرازہ بندی کی۔ کثرت میں وحدت کے جلوے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

ہندستان کی آئین نے تو حال میں دیکھے لیکن گزشتہ ایک ہزار سال سے اردو اسی بنیاد پر پروان چڑھتی رہی ہے۔

اردو کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں ہندوی اثرات سب سے زیادہ رہے۔ شمال میں امیر خسرو، دکن میں نظامی، شمس العشاق، شاہ میراں جی، برہان الدین جانم اور دوسرے صوفیوں کی تحریروں کا لسانی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ تمام عربی اور فارسی زبانوں کے ماہرین اپنے لیے جو بنیادی لسانی وسیلۂ اظہار تلاش کر رہے ہیں، اس کا جھکاو ہند آریائی کی طرف ہے۔ ان ابتدائی کوششوں سے سترھویں صدی تک اہلِ دکن کے ادبی سرمائے کی اُفتاد اس سے ایک رتی الگ نہیں۔ قلی قطب شاہ، مُلّا وجہی اور ولی جیسے شعرا بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں کہ عربی اور فارسی کی ٹھوس روایت کے رمز شناس ہونے کے باوجود انھوں نے ہندوی لہجے کو استحکام بخشنے کا فریضہ انجام دیا۔

اٹھارھویں صدی میں جب شمالی ہندستان میں اردو زبان و ادب کی فصل پھر سے لہلہا اٹھی، اُس زمانے کی تحریروں کا لسانی مطالعہ ایک نئے مزاج کی طرف ہمارا دھیان کھینچتا ہے۔ ایہام گو شعرا بھی ہندی الفاظ کا بڑے پیمانے پر استعمال کرتے ہیں لیکن اب اس کا مقصد تفننِ طبع تھا۔ اہلِ دکن ہندوی اوصاف سے زمینی سطح کی سچائیوں اور انسان کو سنجیدگی سے سمجھنے کے مظاہر ڈھونڈ رہے تھے۔ اسی وجہ سے دہلی میں ہندوی رویہ دکن کی طرح سکۂ رائج الوقت نہیں بن سکا۔

اسی تاریخی موڑ پر اہلِ اردو نے عربی، فارسی روایات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اب زبان و ادب میں دو اعتبار سے یہ سہولت حاصل ہو گئی تھی کہ عربی، فارسی زبانوں کے اثرات بڑھیں۔ پہلی وجہ اردو کے ادیبوں، شاعروں کا بالعموم عربی اور فارسی سے مکمل واقفیت تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ گذشتہ دو سو برسوں میں مغلوں کے زیرِ اثر فارسی شعر و ادب کی غیر مشروط مدد نے ہندستان میں فارسی اور اسی کے ساتھ ساتھ محدود معاملات میں عربی کے لیے طاقت ور بنیاد فراہم کر دی تھی۔ اہلِ ایران بھی ہندستان کی طرف للچائی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اُس زمانے میں فارسی کو ادبی معیار کے طور پر امتیاز حاصل تھا۔

اٹھارھویں صدی میں شمالی ہندستان کے اردو شاعروں اور نثر نگاروں نے خود کو دوراہے پر پایا۔ ایک طرف خسرو سے ولی تک کی تاریخ ہند آریائی رجحان کی طرف انھیں بلا رہی ہے لیکن اسی کے مقابل فارسی اور عربی کی عظیم ادبی روایات اور سماج میں موجود علمی تفوق کی صورت بھی۔ ایہام گویوں نے ہندوی روایات کا مسخ شدہ طور آزما کر اردو کے فارسی مزاج دانوں کو اصلاحِ زبان کی طرف ملتفت ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ اصلاحِ زبان کی تحریک کے پیچھے اہلِ تصوّف کی شمولیت اور پختہ کاری بھی مزید استحکام عطا کر رہی تھی۔ اس طرح فارسی روایت جس میں عربی انداز و اطوار اپنے آپ شامل تھے، اردو میں مقبول ہونے کے لیے سرگرمِ سفر ہو گئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ادب میں شاید ہی کوئی معتبر مثال ہو جس کی پشت پر عرب و ایران کی مُہر نہیں لگی ہو۔

اردو کی ہندوی روایت پورے طور پر معدوم ہو گئی، ایسا سمجھنا تاریخ کی رفتار کے اختلافی رویّوں سے انکار ہوگا۔ نظیر اکبرآبادی کا ادبی سرمایہ حالاں کہ بہت بعد میں ادبی اعتبار حاصل کر سکا لیکن اُس کے لسانی امتیازات کو ان دیکھا نہیں کیا جا سکتا۔ ان دو صدیوں میں اردو نے جس سب سے بڑے غزل گو محمد تقی میر کو پیدا کیا، اُن کے شاعرانہ اسلوب کو فارسیت کے حلقے میں مکمل طور پر ڈال دینا خطرناک ہوگا۔ میر نے اردو غزل کی ایک نئی روایت بنائی اور فارسی اور ہندوی اسلوب کے امتزاج

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

سے ایک ایسا ملا جلا اسلوب تیار کیا جس میں اُس دور کی تمام خصوصیات مجتمع ہو گئی ہیں۔ قدیم شعرا کے اسالیب سے لے کر ان کے کم عمر ہم عصروں کی آوازوں کو بھی انھوں نے اپنے شعری سرمائے میں داخل کر کے اردو کا سب سے بڑا لسانی کارنامہ انجام دیا۔

میر کے اسی بتائے راستے پر اردو نثر نے اپنا سفر شروع کیا اور میر امن سے غالب تک اردو جدید نثر کی جو زمین تیار ہوئی، اس کا لسانی ڈھانچہ میر کی شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سرسید اور پریم چند، پھر ان کے اثرات سے بیسویں صدی کے آخر آخر کی اردو نثر اُسی امتزاجی اسلوب کی پروردہ رہی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ انیسوی صدی میں مغرب کی تیز ہواؤں نے علم وادب اور ہماری زندگیوں میں جو طوفان برپا کیا، اس نے بھی ہندوی اور فارسی کے ملے جلے اسلوب کو قائم رکھا اور اس کے سب سے بڑے وکیل سرسیّد اور محمد حسین آزاد کی زبان بھی اس امتزاجی اسلوب کی حامل ہے۔

یہاں یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ مغربی تہذیب نے اردو کو زم گرم ہواؤں سے محفوظ رکھا یا اردو مغرب کے اثرات سے الگ تھلگ رہی تو یہ ناانصافی ہوگی۔ اردو کے سرمایۂ الفاظ میں یورپی زبانوں کے الفاظ کا دخل ایک بڑی لسانی وجہ ضرور ہے لیکن مغرب کے فیضان کا اردو کے تعلق سے یہ بے حد محدود کام ہے۔ مغرب نے اردو ادب کے مزاج میں ایک سائنسی رجحان اور معروضی نقطۂ نظر کا بیج ڈال کر اس زبان کو دورِ جدید کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ دنیا بھر کے علوم وفنون اور طرح طرح کے تہذیبی عوامل سے تعلق خاطر کا سلیقہ آج اردو کا بنیادی وتیرہ ہے۔ یورپ، امریکہ سے لے کر چین تک اردو کی جو نئی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں، ان کی پشت پر وسیع المشربی اور کھلے پن کا ایسا سرمایہ لدا ہے جس کی برکتوں سے اردو بولنے والے دنیا کے کسی حصّے میں بھی اپنی زبان کو نئے مزاج میں ڈھال سکتے ہیں۔

اردو یقینی طور پر ہند آریائی زبان ہے اور عربی، فارسی اور مغربی اثرات کے باوجود اس کا رجحان امتزاجی ہے۔ مورخین نے دورِ قدیم سے ہی ہندستان کی مٹی کے اس ملے جلے انداز کو پہچان لیا۔ آریاؤں کی آمد سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی تک ہندستان میں باہر سے آنے والوں کے ساتھ آویزش سے زیادہ اشتراک کا ماحول رہا ہے۔ اردو نے ہندستان کے اسی تہذیبی اختلاط کو نشانِ راہ بنا کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جسے ہندستان کی لسانی تاریخ میں کبھی دہرایا نہیں جا سکا۔ بھکتی کال میں صوفیوں اور بھکتوں نے، جب اردو اپنے تشکیلی دور میں تھی، اپنی تعلیمات سے اِس نکتے کو اور بھی استحکام بخشا۔ ہندستان کی جنگِ آزادی کے دوران، اُس کے کافی پہلے فورٹ ولیم کالج میں اور ہندستان کی تقسیم کے موقع سے اِس زبان کے مذہبی انسلاکات پر معترضانہ بحثیں ہوئیں۔ اس کے باوجود اردو نے مخلوط اور مشترکہ کلچر سے اپنے کو کبھی الگ نہیں کیا اور آج تہذیب وثقافت کی واحد نقیب کے طور پر اس زبان کی مقبولیت قائم ہے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be come

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

مختصر گفتگو

۱۔ اردو پر عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کیسے بڑھے؟

۲۔ اردو ہندستانی تہذیب وثقافت کی واحد نقیب کے طور پر کیسے مقبول ہوئی؟

۳۔ کس زمانے کی اردو کا لسانی مطالعہ ایک نئے مزاج کی موجودگی کا پتا دیتا ہے؟

۴۔ اٹھارھویں صدی میں شمالی ہند کے اردو ادیبوں نے خود کو دوراہے پر کیوں پایا؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ ابتدائی زمانے کی اردو پر ہندوی اثرات کو واضح کیجیے۔

۲۔ اردو ادب پر مغربی تہذیب کے کیا اثرات پڑے؟ لکھیے۔

۳۔ اردو کی تہذیبی اور سماجی جڑوں پر ایک تبصرہ پیش کیجیے۔

۴۔ اردو کے امتزاجی مزاج کے پیش نظر ہندستان کی لسانی تاریخ میں اس کے کارنامے کو واضح کیجیے۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions Empowering Technologies

شمالی ہندستان میں اردو کے ابتدائی نقوش

پنجاب اور سندھ کے علاقے سے مسلمان افواج اور حملہ آور جب دہلی میں 1193 میں مستقلاً آباد ہوتے ہیں، اُسی وقت کو محققین نے اردو کی پیدایش کی تاریخ تسلیم کی ہے۔ پنجابی سے اردو کے قدیم سرمائے کی مماثلت اپنی جگہ لیکن عام طور پر محققین نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ اردو کی پیدایش دہلی اور اس کے مضافات میں ہوئی۔ فتح دہلی کے بعد اگلی صدی میں امیر خسروؔ جیسی عظیم شخصیت کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ادبی زبان کے طور پر اردو نے اپنی کارکردگی کا آغاز کردیا تھا۔ امیر خسروؔ کی فارسی تحریروں سے بھی پتا چلتا ہے کہ اُن کے ہم عصر مسعود سعد سلمان نے بھی اپنا اردو دیوان تیار کرلیا تھا لیکن دونوں کا ہندوی کلام ضائع ہوگیا۔

ادب کے طالب علم کے لیے امیر خسروؔ کے ہندوی کلام پر بحث کرنا آسان نہیں۔ اردو کے بڑے محققین اس موضوع سے بار بار بحث و مباحثہ میں شریک رہے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ امیر خسروؔ کے موجود ہندوی سرمائے کی زبان پر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے کیوں کہ ان مکرنیوں، کہہ مکرنیوں، ڈھکوسلوں کی موجودہ زبان اتنی قدیم نہیں لگتی۔ ایسا تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی زبان سات سو سال پرانی ہرگز نہیں۔ حافظ محمود شیرانی، ظ۔ انصاری اور رشید حسن خاں —— سب امیر خسروؔ کے ہندوی کلام کو مستند نہیں مانتے، حالاں کہ تاریخی طور پر یہ طے ہے کہ امیر خسروؔ نے ہندوی میں اشعار کہے تھے لیکن ایسے کلام کی حفاظت زبانی ہونے کی وجہ سے نہیں ہوسکتی۔ اس لیے شمالی ہندستان میں اردو کے پہلے قابلِ ذکر فن کار امیر خسروؔ کے طبع زاد ہندوی کلام کی تلاش میں ناکامی تاریخ ادب کا بڑا المیہ ہے۔

امیر خسروؔ کے ساتھ ہی ہندستان میں صوفیوں اور بھکتوں کے وسیع حلقے میں پھیلنے کی اطلاع ہمیں ملتی ہے۔ خاص طور پر چودھویں صدی عیسوی کے درمیان ہندو اور مسلمان صوفیوں اور بھکتوں نے اردو، یعنی ایک بنتی ہوئی اور خسروؔ کی آزمائی ہوئی زبان کو اپنایا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام'' میں اس دور کی اردو کا مختصر خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ حمیدالدین ناگوری، شیخ بہاالدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایسے معروف صوفیۂ کرام ہیں، جن کے ملفوظات یا شاگردوں کی تحریروں میں ہندوی زبان کے چند جملے یا مصرعے موجود ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ایسی تمام چیزوں کو جمع کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بارھویں صدی سے پندرھویں صدی کے بیچ اس زبان کا کیا رنگ اور روپ تھا۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

اردو کی ابتدائی چیزوں کی تلاش میں گرو گرنتھ صاحب بھی ایک بیش قیمت صحیفہ ہے۔ گرو نانک نے اپنے بزرگ اور بعض معاصرین کی تخلیقات کو گرو گرنتھ صاحب میں جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس میں نام دیو اور کبیر داس کے ساتھ گرو نانک کی شاعرانہ عظمت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ وہ زمانہ بھکتی تحریک کا ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں صوفیا اپنے اپنے رنگ میں سماج سُدھار کا کام کر رہے ہیں لیکن اس زمانے کے بعض لوگ اپنی تعلیمات کی وجہ سے شاگردوں کے حوالے سے ملک کے طول و عرض تک پہنچ گئے۔

بھکتی تحریک نے اس ترقی پذیر زبان کو تہذیب و تمدن کے نئے وسائل سے ہم کنار کرایا۔ اتفاق سے اردو کے ابتدائی سرمائے پر گفتگو کرتے ہوئے اکثر ناقدین بھکتی تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے ادب کو علاحدہ سے اہمیت نہیں دیتے۔ اس وجہ سے اردو کی ادبی تاریخ میں شمالی ہندستان میں امیر خسرو کے بعد کوئی تین سو برسوں تک اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یہ اندھیرا اصل میں بھکتی تحریک کے سرمائے سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے سامنے آیا جب کہ اس دور میں سُورداس، تلسی داس، نام دیو، تکا رام کے ساتھ ساتھ کبیر اور جائسی بھی موجود ہیں۔

شمالی ہندستان میں اردو کی پہلی مستقل تصنیف محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہے جس کا سنہ تحریر 1625 مانا گیا ہے۔ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مثنوی ''کدم راو پدم راو'' سے شمال کی اس ''بکٹ کہانی'' تک دو سو برس گزر چکے ہیں۔ شمالی ہندستان میں اردو شاعری کا یہ پہلا مستقل نمونہ ہے۔ یہ عام عشقیہ دستاویز ہے اور اس پر بارہ ماسہ کا رنگ غالب ہے۔ سہارن پور کے رہنے والے روشن علی کی رزمیہ مثنوی ''عاشور نامہ'' ایک اہم ابتدائی کتاب ہے جو 1688 میں تصنیف کی گئی۔ یہ تقریباً 3500 اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع واقعاتِ کربلا ہے۔ اسماعیل امروہی کی مثنوی ''وفات نامہ بنتِ فاطمہ'' سترھویں صدی کی آخری تصنیف قرار دی جائے گی جسے اس کے مصنف نے 1693 میں تحریر کیا۔ سترھویں صدی میں ''خالق باری'' مصنفہ ضیاالدین خسروی ایک اہم دستاویز ہے۔ مذہبی کتابیں لکھنے کا چلن بھی اردو میں ہو گیا تھا۔ شیخ عبداللہ انصاری کی ''فقہ ہندی'' کا ذکر بھی ضروری ہے جو سترھویں صدی کی اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔

اٹھارھویں صدی سے قبل شمالی ہندستان میں اردو کی کوئی مستقل نثری تصنیف دکھائی نہیں دیتی، حالاں کہ دکن میں اس کی ٹھوس روایت سامنے آ چکی ہے۔ اٹھارھویں صدی اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اب اہلِ اردو شمالی ہندستان میں نثر کی طرف بھی متوجہ ہو رہے ہیں۔ شمالی ہندستان کی پہلی نثری تصنیف ''کربل کتھا'' ہے، جس کے مصنف فضل علی فضلی ہیں۔ یہ کتاب 1732 سے 1733 کے درمیان لکھی گئی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کتاب سے پورے ایک سو برس قبل اہلِ دکن نے اپنا نثری شاہکار ''سب رس'' لکھ دیا تھا۔ ''کربل کتھا'' واقعاتِ کربلا سے متعلق ہے لیکن شمالی ہندستان کی پہلی غیر مذہبی ادبی تخلیق ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کو مانا جاتا ہے جسے عیسوی خان بہادر نے 59-1732 کے درمیان لکھا تھا۔ مسعود حسین خاں نے اس کتاب کی زبان کو قصہ گوئی اور لسانی ارتقا دونوں پہلوؤں سے اہم مانا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں شمال میں چند اور بھی کتابیں لکھی گئیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

''نوادرالالفاظ'' تیار کی۔ اس کتاب سے اردو کے تئیں لسانی تبدیلیوں کی جانچ پرکھ کی جاسکتی ہے۔ عطا حسین خاں تحسین نے 1798 میں ''نوطرزِ مرصع'' لکھی۔ قصہ گوئی کی ایک اہم کتاب ''عجائب القصص'' بھی اٹھارھویں صدی کے اواخر کی یادگار ہے، جس کے مصنف شاہ عالم ثانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں شاہ مولوی رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن پاک کے اردو ترجمے کیے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ شمالی ہندستان میں اردو کی پیدائش ہونے کے باوجود اردو سے متعلق تصنیفات کا اچھا خاصا فقدان ہے۔ ایک غیر آباد علاقے دکن میں جا کر اس زبان نے اپنا بڑا سرمایہ رکھ چھوڑا لیکن اسی زمانے میں شمالی ہندستان کے ادبی منظرنامے پر بڑی تعداد میں شعری اور ادبی تصنیفات موجود نہیں ہیں۔ اس کی کوئی ایک وجہ بتانا مشکل ہے لیکن شاید اشرافیہ سماج میں فارسی کو دیگر زبانوں پر فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے اردو تحریروں کو اوّلین اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ لوگوں نے فارسی کے مقابلے اس نئی زبان کو محفوظ رکھنا شاید ضروری نہیں سمجھا۔ یہ ساجی کوتاہی شمالی ہندستان میں امیر خسرو سے لے کر اٹھارھویں صدی تک موجود ہے۔ اس کے باوجود شمالی ہندستان میں اردو کی بار آور نسل دھیرے دھیرے تیار ہو جاتی ہے جس کی منتہا اٹھارھویں صدی کی شاعری اور انیسویں صدی کی نثر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مختصر گفتگو

۱۔ امیر خسرو کے موجود ہندوی کلام پر سوالیہ نشان کیوں لگا ہوا ہے؟

۲۔ چار ایسے صوفیہ کے نام لکھیے جن کی تحریروں میں ابتدائی ہندوی زبان کے نمونے ملتے ہیں؟

۳۔ شمالی ہندستان میں اردو کی پہلی مستقل تصنیف کسے قرار دیا جاتا ہے؟

۵۔ نوطرزِ مرصع کس سال لکھی گئی۔ اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''اردو کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش میں بھگتی تحریک کے زیرِ اثر لکھا گیا ادب معاونت کر سکتا ہے۔'' اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔

۲۔ ''شمالی ہندستان میں اردو کی ابتدائی تخلیقات'' ـــــ اس موضوع پر ایک مختصر مقالہ قلم بند کریں۔

۳۔ اردو شمالی ہندستان میں پیدا ہوئی لیکن اس کا ابتدائی ادب سرمایہ دکن میں ملتا ہے۔ اس کے پیچھے کون سے اسباب ہیں؟

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abiel.in). Publishing web/App/Books will be come
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اردو کی ابتدائی نشو ونما میں

صوفیۂ کرام کا حصّہ

اردو جدید ہند آریائی زبان ہے اور جس عہد میں اسے زبان کا درجہ حاصل ہوا، وہ ہندستان کی لسانی، تہذیبی، سماجی تاریخ کا نہایت متحرک دور تھا۔ سماجی، سیاسی صورت حال پر توجہ دیں تو چھٹی صدی عیسوی کے بعد جس زمانے میں مسلمانوں کی ملک میں آمد شروع ہوئی، اس وقت تک برہموں اور بودھوں کے درمیان طویل تہذیبی آویزشیں نتیجہ خیز حد تک قائم ہو چکی تھیں۔ اونچ نیچ اور اعلا اونا کے طبقوں میں بٹے سماج میں جب بودھوں نے سماجی رواداری کا سندیش دیا، اس وقت برہمنی سماج کی لسانی اجارہ داری کا تقریباً خاتمہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ سنسکرت کے بجائے پالی اور پراکرتوں کا فروغ اور عوامی اعتماد کا حاصل ہونا، یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ہندستان کا لسانی نقشہ تبدیل ہو رہا ہے۔ اس عہد میں تعلیم کو کسی ایک طبقے میں محدود رکھنے کی سازش کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ہندستان میں جب ساتویں صدی میں عربی نژاد مسلمان پہلی بار آئے تو ان کا پیشہ کاروبار تھا۔ مالابار کے ساحل پر وہ بسے اور لسانی اعتبار سے دراویڈی خاندان کی سخت مٹی سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سامی خاندان کے یہ لوگ تجارت اور مذہب کے سلسلے سے جو بھی تجربے کر رہے ہوں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے یہ لوگ واقعتاً ایک جزیرہ بننے پر مجبور ہوئے۔ پالی عوامی سطح پر سنسکرت کو سمیٹنے کے بعد خود منجمد ہو رہی تھی اور عوامی سطح پر معدود پراکرتوں کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ ساتویں صدی کے بعد اب عربی نژاد حملہ آور کی شکل میں ملک کے شمال مغربی علاقے سے داخل ہوتے ہیں۔ غور کریں تو آج کے اعتبار سے ہندستان کی سرحد کے اندر وہ خطہ پنجابی اور سندھی زبانوں سے ہم رشتہ رہا ہوگا جن کی قدیم شکلوں کا کوئی ثبوت ماہرینِ لسانیات کو حاصل نہیں ہو سکا۔ محمد بن قاسم کی آمد سے لے کر محمود غزنوی تک عربی اور فارسی یا ترکی زبانوں کے ساتھ ہندستانی حلقے میں جو حملہ آور آئے، انھوں نے اس ملک کی سیاسی، سماجی اور لسانی تاریخ کی کایا پلٹ دی۔ خود ہندستانی خطہ میں ہند آریائی زبانوں کی تاریخ میں وہ عہد تبدیلیوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ طاقت ور اور مہتم بالشان زبانیں ہوا ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی بولیاں اور معمولی لوگوں سے ربط رکھنے والی زبانوں کا فروغ ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے جو تہذیبی اور لسانی اشتراک کا سلسلہ قائم ہوا تو پہلی بار ہندستان میں نہ صرف یہ کہ مذہب میں

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Engineering Technologies

تکثیریت کا اثر پیدا ہونے لگا بلکہ ملک کے لسانی منچ پر بولیوں اور زبانوں کا لین دین بھی شروع ہونے لگا۔ بھانت بھانت کے لوگ اور حسبِ تہذیبی عوامل کے درمیان جب شورسینی پراکرت اور اپ بھرنش نے مدھیہ دیش کی بولیوں میں اپنا وقار پایا، اس عہد کا لسانی نقشہ ایک بنتی ہوئی زبان کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ یہ بنتی ہوئی زبان مسلمانوں کی آمد سے اپنی واضح شکل لینے میں کامیاب ہوئی۔ بعض لسانیاتی ماہرین نے بھی اس سے اتفاق کا اظہار کیا ہے لیکن یہ مکمل سچائی نہیں۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی دلیل معقول ہے کہ اردو زبان اگر ہندستان میں مسلمان نہیں آتے، تب بھی ضرور پیدا ہوتی کیوں کہ اس کی پیدائش کے تمام بنیادی محرکات اصل میں مقامی یعنی ہندستانی تھے۔ مسلمانوں نے جو کثیر مذہبی اور لسانی ماحول قائم کیا، اس کا اصل فائدہ یہ ہوا کہ لسانی تبدیلیوں کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔ اسی لیے پروفیسر چٹرجی یہ مانتے ہیں کہ اردو کی پیدائش میں مسلمانوں کی آمد نے ایک Catalyst کا کام کیا۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندستان میں اگر مسلمان نہیں آتے تو اردو کی پیدائش میں سو دو سو سال مزید انتظار کرنا پڑتا۔

کثیر لسانی اور کثیر مذہبی ماحول میں اقوام اور زبانوں کی ترقی کا انداز ہمیشہ سے مخلوط رہے گا۔ میل جول اور مشترکہ عوامل کی بنیاد پر جو سلسلہ قائم ہوگا، اس کی ترقی کے راستے آسانی سے کھلیں گے کیوں کہ یہی فطری سلیقہ ہوگا۔ تاریخ کے ابواب شاہد ہیں کہ ہندستان میں مسلمان بادشاہوں نے اگر ایک طرف اپنی افواج کی قطاروں کے ساتھ حملہ کیا تو دوسری طرف علما، صوفیا، حکما اور اطبا کی ٹولیاں بھی ہم رکاب رہیں۔ ہندستان میں صوفیوں کی ٹولیاں بادشاہوں سے الگ رہ کر اپنی آزادانہ پہچان قائم کرنے میں کامیاب رہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی سے یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صوفی انسانی محبت اور رواداری کی بنیادوں پر مذہب کا پیغام ہندستانی عوام تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن معاملہ 'زبانِ یارِ من ترکی و منِ ترکی نمی دانم' کا تھا ایسے ہی مرحلے میں صوفیوں کے لیے اردو نئے اور مؤثر ذریعے کے طور پر سامنے آئی۔ یہ ان گڑھ اور کچی زبان عوام و خواص دونوں کے بیچ پل کا کام کر سکتی تھی۔ صوفیا کے پاس مذہبی تعلیمات کی ترسیل کے لیے اس سے زیادہ کارگر لسانی وسیلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے بعد صوفیا کے ملفوظات و رسائل میں عربی اور فارسی کے پہلو بہ پہلو اردو کے الفاظ اور جملے استعمال میں آنے لگتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عام طور پر اردو میں شاعری اور نثر کا کوئی دوسرا نمونہ نہیں ملتا۔ بعض ہندی ناقدین بالخصوص پروفیسر نامور سنگھ اپنی تحقیق میں دسویں صدی اور اس سے متصلاً قبل کے صوفیوں اور ناتھ پنتھ کے مذہبی پیشواؤں کی تحریروں سے جن کی زبان اپ بھرنش تھی، ہندوی کے الفاظ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آٹھویں سے بارھویں صدی کے دوران اسلامی تعلیمات پر مبنی تحریروں کا مطالعہ سامنے آچکا ہے لیکن بودھ اور ہندو مذہب سے متعلق تحریروں پر تحقیق ہونی ابھی باقی ہے۔ شبیر علی کاظمی نے اپنی مختصر تصنیف ''پھر اچین اردو'' میں بودھ بھکشوؤں کے دوہوں کے تراجم کیے ہیں اور ان میں اردو الفاظ کا سراغ لگایا ہے۔ یہ سرمایہ ۱۰۰۰ء تک کا ہے۔ لیکن اس پر مزید کام ہونا چاہیے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ابتداً مولوی عبدالحق اور پھر دیگر اصحاب نے صوفیہ کے تعلق سے تحقیقات کر کے اپنے نتائج پیش کر دیے۔

ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے عہدِ جدید میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں میں مذہبی اصلاح کی ملک گیر سطح پر

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in) Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمان صوفی اور ہندو بھگت مذہب کے سماجی مفاہیم کو بالکل نئے انداز میں سامنے لا رہے تھے۔ ان صوفیوں اور بھگتوں کے یہاں مختلف طبقے ملتے ہیں۔ اعتقادات اور نقطۂ نظر میں بھی ایک دوسرے کے بیچ اچھا خاصا فرق ہے۔ ایک بھگت مُورتی پوجا میں وشواس کرتا ہے اور دوسرا بھگت 'مورتی بھنجک' ہے۔ ایک صوفی شریعت کی سخت گیری کو قائم کرنا چاہتا ہے اور دوسرا رواداری کے پیمانے چھلکا رہا ہے۔ ہندستانی سماج میں یہ لوگ پانچ سو سے زیادہ برسوں تک اپنی بااثر سرگرمیوں سے ہماری توجہ کھینچ رہے تھے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان اصحاب رشد و ہدایت نے جس بولی اور زبان میں اپنے ملفوظات چھوڑے، انھیں محفوظ رکھنے میں سماج نے کوتاہی کی۔ بڑی تعداد میں اصل بولیوں کا سرمایہ ضائع ہوا۔ لوگوں نے فارسی، عربی کی عظمت کے سامنے ابھرتی ہوئی عوامی زبان میں موجود ادبی سرمایے کو محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ دوسروں کی کون کہے، امیر خسرو کا جو ہندوی کلام ہمارے تصرّف میں ہے، اس کے معتد بہ حصّے کو مستند قرار دینے میں محتاط محققین کو دشواری پیش آتی ہے۔ اسی لیے اس عہد سے متعلق متن کم سے کم دستیاب ہے اور اُسی پر قناعت کر کے اردو ادب کی مختلف کڑیوں کو جوڑنا ہماری مجبوری ہے۔

مولوی عبدالحق کی مختصر کتاب 'اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا حصّہ' اس اعتبار سے قاموسی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں صوفیۂ کرام کے ملفوظات اور دیگر علمی ذرائع سے حاصل شدہ ایسے مواد کو جمع کرنے کی پہلی بار کوشش کی گئی ہے جس میں اردو کا استعمال ہوا ہو۔ حالاں کہ قاضی عبدالودود کا اعتراض اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ مولوی عبدالحق نے اطلاعات جمع کرنے کے جوش میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ ان تحریروں کا پایۂ استناد کتنا ہے۔ بعض مجہول روایتیں اور گمنام بیاضوں کو کھلے بندوں آخری نمونے کے طور پر استعمال کرنا تحقیقی آداب کے خلاف ہے۔ اس موضوع سے متعلق تحقیقات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں ایک مختصر باب کا اضافہ بھی کیا۔ اس طرح ہم آج اس حالت میں ہیں کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیۂ کرام کی خدمات کا اعتراف کر سکیں۔

امیر خسرو کے ہندوی کلام سے متعلق تحقیقی تنازعات بہت ہیں لیکن مختلف شواہد کی بنیاد پر یہ بھی ایک طے شدہ امر ہے کہ خسرو نے ہندوی میں اچھا خاصا کام کیا۔ خسرو کے فارسی کلام میں ہندوی کے الفاظ اور محورات موجود ہیں۔ خسرو کے اصل متن میں الحاقی حصّہ کتنا ہے اور اصلی کتنا، اس کا تعیّن آج ناممکن ہے لیکن خسرو کا ہندوی میں رنگِ شاعری کیا ہے، اس سے ایک عالم واقف ہے۔ اسی طرح ابتدائی صوفیوں میں شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ باجن، حمیدالدین ناگوری، بوعلی شاہ قلندر، شرف الدین یحییٰ منیری، عبدالقدوس گنگوہی جیسے صوفیوں کے ملفوظات سے مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ انھوں نے رشد و ہدایت کے کام میں اس نئی زبان اردو کا استعمال کیا۔ ان صوفیۂ کرام کے شانہ بہ شانہ بھگتی آندولن سے متعلق افراد میں نام دیو، کبیر، گرونانک کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کے یہاں تخلیقی سطح پر جس زبان کا استعمال ہو رہا تھا، اُسے اردو کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اردو کے ارتقا کی ابتدائی کڑیوں کو جوڑنے میں صوفیۂ کرام کے دستاویزات وہ لسانی قطب نما ہیں جن کی مدد سے ہم اردو کے ارتقا کے تسلسل کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ اردو کی پیدائش اور دکن میں ادبی زبان کے طور پر ابھرنے کے بیچ جن تین چار سو برسوں کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

وقفہ ہے، اس میں لسانی تبدیلیوں کے عوامل انھی صوفیا اور بھکتوں کی تحریروں میں ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ بھکتی تحریک سے متعلق تحقیق کا زیادہ کام نہیں ہوسکا اور صوفیۂ کرام کے ملفوظات کا ادبی اور لسانی استعمال بھی کم کم ہوا۔ ورنہ ہمارے پاس اس سے زیادہ سرمایہ ہوتا اور ہم اردو کی ابتدا کے بعض تاریک گوشوں کو روشن کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔

مختصر گفتگو

۱۔ ہندستان میں مسلمانوں کی آمد نے ہند آریائی زبانوں کے ارتقا پر کیا اثر ڈالا؟

۲۔ زبانوں کے بننے میں تہذیبی اور لسانی اشتراک کی اہمیت واضح کیجیے۔

۳۔ بودھ اور ہندومت کی تحریروں کے مطالعے سے اردو کی پیدایش سے متعلق نظریات میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ اپنے تصورات قلم بند کیجیے۔

۴۔ امیر خسرو کے غیر مستند ہندوی کلام سے کون سے مثبت نتیجے برآمد ہوئے ہیں؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''اردو زبان اگر ہندستان میں مسلمان نہیں آتے تب بھی ضرور پیدا ہوتی''۔ اس قول سے اتفاق یا اختلاف کرتے ہوئے اپنا خیال واضح کیجیے۔

۲۔ اردو کی پیدایش میں صوفیہ کے رول کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ مولوی عبدالحق کی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیۂ کرام کا حصہ'' کس حد تک معتبر ہے؟ وضاحت کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

دکن میں اردو زبان وادب کا ارتقا

اردو کی ابتدا کا مسئلہ محققین اور ماہرین لسانیات کے درمیان پیچیدگی کا باعث بنا رہا ہے۔ تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو سمیٹنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا۔ پنجاب اور دہلی میں اردو کے بننے کا جو عمل ہمیں معلوم ہے، اس میں امیر خسرو کے علاوہ چودھویں صدی عیسوی تک کوئی دوسری شخصیت نہیں ملتی جس پر ادبی انحصار کیا جا سکے۔ امیر خسرو کی ہندوی تحریریں حالات کی نذر ہو گئیں۔ آج ان کے نام سے جو منسوب کلام ملتا ہے، انھیں حتمی طور پر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خسرو سے ہی وابستہ ہیں۔ کم سے کم اتنا طے ہے کہ ان کی زبان 700 برس پرانی نہیں۔ اس وجہ سے اردو کا پہلا اہل قلم ماننے کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا ہندوی اثاثہ کون سا ہے اور کتنا ہے؟

محمد بن تغلق نے ایک سیاسی ضرورت کے تحت اپنے دارالسلطنت کو چودھویں صدی میں دہلی سے دکن منتقل کیا۔ تب بادشاہ کے قافلے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں عالم، زبان داں اور مذہبی پیشوا دہلی سے دکن پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخی ثبوت موجود ہے کہ دکن میں یہ شمالی ہند کے اصحاب علم و دانش بڑی تعداد میں بس گئے۔ چودھویں صدی میں دکن میں بہمنی سلطنت کا عروج ہوتا ہے۔ سلطنت کے کام کاج میں فارسی اور عوامی رابطے کے لیے دہلی اور اس کے مضافات میں آزمائی ہوئی زبان اردو موجود تھی۔ دکن کو پنجاب اور دہلی کے بعد اردو کی تشکیل کی تیسری تجربہ گاہ ماننا چاہیے۔ جہاں مختلف ڈراوری زبانوں سے علاحدہ شمال کی یہ زبان بہت تیزی سے اپنی ترقی کی منزلیں سر کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ایک عرصہ تک خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اردو کا پہلا کارنامہ مانا جاتا تھا۔ بندہ نواز کی موت 1421 میں ہوئی، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف اس سے قبل کی ہونی چاہیے لیکن بعض محققین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ جو کتاب خواجہ بندہ نواز سے منسوب کی جاتی ہے، وہ اصل میں ان سے کم سے کم 200 برس بعد کی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے ''معراج العاشقین'' کو لسانی بنیادوں پر تول کر یہ فیصلہ حتمی کر دیا ہے کہ ''معراج العاشقین'' کی قدامت مشتبہ ہے اور اس کا کسی بھی اعتبار سے خواجہ بندہ نواز سے تعلق نہیں ہے۔ اسی زمانے کے ایک اور صوفی شیخ عین الدین گنج العلم جن کی وفات 1392 میں ہوئی، ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ''رشد و ہدایت'' کے مرحلے میں مقامی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن ان کی کسی تحریر کا اب تک پتہ نہیں چلا۔

سرزمین دکن سے جو پہلی کتاب دستیاب ہوئی ہے، وہ بہمنی سلطنت کے نویں بادشاہ ولی بہمنی کے دور حکومت

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

1434-1421 میں لکھی گئی فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راو پدم راو'' کو جمیل جالبی نے غایت جاں فشانی کے بعد مثنوی کے مخطوطے کے عکس کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ یہ عام عشقیہ کہانی دکن کے مخصوص ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی دور میں شاہ میراں جی شمس العشاق (وفات1496) نے تصوف کے موضوع پر بعض رسائل اور نظمیں لکھیں۔ ''شہادت الحقیقت'' اور ''خوش نامہ'' ان کی ایسی تخلیقات ہیں جن میں ہندی بحور کا استعمال کیا گیا ہے۔ سید شاہ اشرف بیابانی نے چودھویں صدی کی ابتدا میں ''نوسرہار'' جیسی مثنوی لکھی۔ یہ تخلیق ہے تو مرثیہ لیکن ہیئت مثنوی کی ہے۔ اسی دور میں خواجہ بندہ نواز کے پوتے سید عبداللہ حسینی نے ''نشاط العشق'' کا دکنی میں ترجمہ کیا۔

بہمنی سلطنت یوں تو 1527 تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی لیکن پندرھویں صدی کے آخر سے ہی علاقۂ دکن پانچ خود مختار سلطنتوں میں بٹتا دکھائی دیتا ہے۔ برید شاہی اور عماد شاہی حکومتیں 1487 سے ہی بیدر اور برار میں قائم ہو جاتی ہیں۔ 1490 سے نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں احمد نگر اور بیجاپور میں برسرِ اقتدار ہو جاتی ہیں۔ 1512 میں گول کنڈہ میں قطب شاہی حکومت بنتی ہے۔ ان تمام حکومتوں کا اورنگ زیب کے فتح دکن کے قبل تک وجود قائم رہتا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ سے ان کا ان معنوں میں گہرا رشتہ ہے کہ سترھویں صدی تک اسی علاقے میں اردو کے شعرا اور ادبا پیدا ہوئے۔ ایک اور بات یہ کہ عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں نے اس نئی زبان کے فروغ کے لیے اپنی حکومت کی جو دریا دلی دکھائی، وہ تاریخ کے صفحات کا ایسا زریں باب ہے۔ جس کی قوت کے بغیر آج اردو کا کارواں ترقی کی منزلوں تک نہیں پہنچ پاتا۔

گول کنڈہ اور بیجاپور سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں اردو کے دو ایسے مراکز ہیں جن کی خدمات بہت ہیں۔ آج یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں نے اس نئی نویلی زبان کے لیے آخر کیوں اتنی سرگرمی دکھائی۔ جب کہ ان کے پاس فارسی جیسی مسلمہ زبان موجود تھی جس میں طویل مدت سے شعر و ادب کا ذخیرہ جمع ہو رہا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب ہندستان میں مغلوں نے اپنی حکومت کی بے پناہ توسیع کی۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغلوں کی حکومت کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ملک میں فارسی زبان کا بول بالا بڑھا۔ لیکن دکن کی جن دو ریاستوں نے مغلوں سے الگ راستہ اپنایا اور ایک تازہ وارد زبان اردو کو اپنی محبت اور نصرت عطا کی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں حکومتیں مغلوں سے الگ اپنے وجود کو استحکام دینا چاہتی ہوں گی۔ خاص طور سے ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کو سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ان تینوں بادشاہوں نے فارسی کے بجائے اردو میں خود بھی شاعری کی۔

عادل شاہی دور میں ہمیں سب سے پہلے ''کتاب نورس'' کا پتا چلتا ہے۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کی تخلیق ہے۔ اسی دور میں دکن کا دوسرا بڑا شاعر نصرتی موجود ہے جس کی مثنویاں ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' اردو کی قدیم کتابوں میں اب بھی ممتاز تسلیم کی جاتی ہیں۔ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا اور فنِ قصیدہ گوئی میں عہدِ سودا سے پہلے وہ بلاشبہ سب سے بڑا شاعر ہوا۔ برہان الدین جانم کی ''کلمۃ الحقائق'' دکن کی پہلی نثری تخلیق ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مثنویاں بھی تحریر کیں جن میں ''ارشاد نامہ'' اور ''وصیت الہادی'' قابل ذکر ہیں۔ برہان الدین جانم ایک بزرگ صوفی تھے اور تصوف کے موضوع پر ان کی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technology

تصنیفات کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کے صاحب زادے امین الدین اعلا نے بھی اپنی تعلیمات کے لیے اسی زبان کو آزمایا۔ ان کے رسائل ''کلمۃ الاسرار''، اور ''گنج مخفی'' دکنی نثر کی ابتدائی کتابوں میں لسانی ارتقا کا ایک اہم پڑاو ہیں۔

عادل شاہی حکومت ایک بڑے جغرافیائی علاقے میں تھی۔ اس وجہ سے صوفیا سے الگ عشقیہ شاعری کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ رستمی نے 27 ہزار اشعار کی مثنوی ''خاور نامہ'' 1649 میں تخلیق کی۔ سیّد میراں ہاشمی کی ''یوسف زلیخا'' مَلِک خوشنود کی ''جنت سنگار''، صنعتی کے ''قصۂ بے نظیر'' اور مرزا محمد مقیم مقیمی کی 'چندر بدن مہیار' حسن شوقی کی ''فتح نامہ نظام شاہ'' کے ساتھ عبدل کی ''ابراہیم نامہ'' ایسی تخلیقات ہیں جن پر غور کیے بغیر دکن میں اردو مثنوی اور قصیدے کا کس طرح ارتقا ہوا، یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

دکنی ادب کے ارتقا میں قطب شاہی حکومت کا کارنامہ عظیم تر ہے۔ یوں تو اس حکومت کے آٹھ بادشاہ ہوئے لیکن اس کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ ایک ایسی جادوئی شخصیت کا مالک ہے جس سے دکن میں شاعری اور نثر کے وہ کارنامے سامنے آئے جنھیں اردو کی ادبی تاریخ کے سرمائے میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ کے علاوہ اس کے بعد کے بھی تینوں بادشاہ محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ بھی باضابطہ شاعر تھے اور ان کے دواوین موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ نے تو تقریباً 50 ہزار اشعار کہے۔ یہ مشہور ہے کہ وہ دربار میں شاعری میں گفتگو کرتا تھا۔ دکنی سلطنتوں میں قلی قطب شاہ کی حکومت کا دور 1580 سے 1611 سلطنت کی وسعت، جدید کاری، تعمیرات اور ادب و ثقافت کے شعبوں میں بے مثال ترقیات سے عبارت ہے۔ یہ اکبر اعظم کا معاصر تھا۔ اس شخص نے ''مراشہر عالم میں مشہور ہو'' کے خواب کے ساتھ 1591 میں حیدرآباد کی بنیاد ڈالی۔ قطب شاہ کی عشقیہ شاعری، وطن دوستی اور زبان و بیان کے ساتھ تہذیب و معاشرت میں میل جول کے جذبے کو فروغ دینا، ایسی خدمات ہیں جن کا جواب امیر خسرو کے علاوہ اردو کی ادبی تاریخ میں کوئی نہیں۔

ملاّ وجہی، قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ ادبی اعتبار سے ارضِ دکن سے اگر دو اہم کتابوں کا انتخاب کرنا ہو تو وہ دونوں کتابیں قطب مشتری اور سب رس ہوں گی۔ محمد قلی قطب شاہ کی محبت کی داستان لکھتے ہوئے ملاّ وجہی نے 1609 میں وہ عظیم مثنوی رقم کی جس سے اب باضابطہ مثنوی کی تاریخ شروع کی جاتی ہے۔ وجہی نے تین بادشاہوں کا دور دیکھا: محمد قلی، محمد قطب اور عبداللہ قطب شاہ۔ اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ اصل عروج کے وقت اس کا محسن قلی قطب شاہ گزر گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کو شعر و ادب سے دلچسپی تو تھی لیکن اس کے دربار میں وجہی کا سب سے بڑا حریف غواصی موجود تھا۔ اس لیے اس مرتبہ وجہی نے اپنی صلاحیت کے جواہر ریزے نثر میں بکھیرنے کا منصوبہ بنایا اور قصۂ حسن و دل کو 1635 میں ''سب رس'' کے نام سے پیش کر دیا۔ یہ دکن میں اردو کی ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے نثری تعلیمات تصوف اور مذہبیات سے متعلق تھیں۔ ''سب رس'' اپنی بے مثال نثر نگاری اور قصہ گوئی کی خوبیوں کی وجہ سے اب بھی اردو نثر کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

قطب شاہی دور میں وجہی کے علاوہ دو بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ غواصی اور ابن نشاطی۔ غواصی کی دو مثنویاں ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' دکن کی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ابن نشاطی نے 1655 میں ''پھول

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

بن'' کی تخلیق کی۔ ان کے علاوہ قطب شاہی دور میں فیروز، محمود، ملا خیالی، جنیدی، میراں جی یعقوب اور سید بلاقی ایسے شعرا ہیں جن کی تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قلی قطب شاہ کے بعد فرماں رواؤں میں کوئی ایسا دکھائی نہیں دیتا جس نے بڑے پیمانے پر علم وادب کی توسیع کے لیے اپنی حکومت کا خزانہ کھول دیا ہو۔ اس لیے دکنی ریاستوں کے زوال کے پہلے سے ہی شعر وادب کی بزم میں ایک انتشار کا ماحول ہے۔ بریدشاہی، عمادشاہی اور نظام شاہی حکومتیں تو سترھویں صدی کے نصف سے پہلے ہی اختتام پذیر ہو چکی تھیں لیکن اورنگ زیب کے دکن کو فتح کرنے اور عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کو 1686 اور 1687 میں زیر کر لینے سے پہلے دکنی شعروادب کی وہ آخری نسل ہمارے سامنے آ چکی تھی جس کی قیادت بجا طور پر ولی کر رہے تھے۔

سترھویں صدی کے آخری زمانے میں بحری، وجدی، ذوقی اور فراقی جیسے شعرا بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ولی کے زور کے سامنے ان میں سے کسی کا وجود معنی نہیں رکھتا۔ ولی، دکن، اورنگ آباد یا گجرات میں کہاں پیدا ہوئے، یہ ادبی تاریخ نویسی کی ایک عجیب گتھی ہے لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دکنی ادب کی تین صدیوں کے ارتقا کی وہ سب سے مضبوط اور روشن کڑی کے طور پر ایک نمایندہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آخر ولی کی زبان میں مقامیت یا دکنیت کم نہیں ہو چکی ہوتی اور لسانی تجربوں کی ایک منزل نہیں آ چکی ہوتی تو یہ بھلا کیسے ممکن ہوتا کہ 1700 میں دہلی آمد کے ساتھ شمالی ہندستان میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ولی کی شاعری اصحاب دہلی کے لیے ایک ایسے طوفان کی طرح تھی جس نے انھیں نئے انداز و اطوار کے ساتھ پھر سے زندگی شروع کرنے کا راستہ دکھایا۔ یہ مانا جائے کہ ولی کی نگرانی میں ہی اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اردو کا نیا لسانی مزاج تیار ہوا۔ جس کے بہترین قائد محمد تقی میر تسلیم کیے گئے۔ دکن کے دورِ آخر کے شاعروں میں سراج اورنگ آبادی کی اہمیت مسلّم ہے۔ سراج نے 24 برس کی عمر میں شعر گوئی ترک کر دی۔ اس کے باوجود عشق و مستی کے ساتھ متصوفانہ خیالات کی پیش کش اس کا بڑا کارنامہ ہے جس کے اثرات دہلی پر بھی پڑے۔

اس تفصیلی گوشوارے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پندرھویں سے سترھویں صدی تک اردو کے ارتقا اور ادبی زبان کے طور پر اس کے ابھرنے کا سارا کارنامہ اہلِ دکن کا ہے۔ اہلِ دکن کثیر لسانی ماحول میں پرورش پانے والے لوگ تھے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی ان میں الگ الگ انداز و اطوار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق و مستی کے ساتھ تصوف بھی ایک سماجی کیفیت ہے۔ اردو شعروادب اگر آج بھی معاشرتی ہمہ جہتی اور ہم آہنگی کا پاسدار ہے تو کہنا چاہیے کہ یہ بھی اہلِ دکن کا خاص اثر ہے لیکن محمد بن تغلق کے دہلی سے دکن جانے اور ولی کے دہلی آ جانے سے ایک ادبی دائرہ (cycle) مکمل ہو جاتا ہے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

مختصر گفتگو

۱۔ اردو ارضِ دکن تک کیسے پہنچی؟
۲۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد وجود میں آنے والی ریاستوں کے نام لکھیے۔
۳۔ عادل شاہی دور کی یادگار تین مثنویوں کے نام مع تخلیق کار درج کیجیے۔
۴۔ غواصی اور ابنِ نشاطی کی کتابوں کے نام لکھیں۔
۵۔ ملا وجہی کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔
۶۔ دکن کے شاعر بادشاہوں کی فہرست تیار کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''معراج العاشقین اردو کا پہلا کارنامہ نہیں ہے۔'' واضح کیجیے۔
۲۔ بہمنی دور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
۳۔ دکنی مثنویوں کا مختصر جائزہ لیجیے۔
۴۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعرانہ خدمات پر تبصرہ کیجیے۔
۵۔ ولی کی غزل گوئی کے امتیازات واضح کیجیے۔
۶۔ 'اردو شمال میں پیدا ہوئی لیکن اس نے ترقی کی ابتدائی منزلیں دکن میں طے کیں، اس قول سے آپ کو کس حد تک اتفاق ہے؟

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

دہلی اور لکھنؤ میں شعر و ادب کا ارتقا

اردو دکن میں ایک اچھی خاصی مدت تک پھلنے پھولنے اور ارتقا کے راستے طے کرتی ہوئی پھر سے جب اٹھارھویں صدی کے آغاز میں دہلی میں رونق افروز ہوئی، اس وقت دہلی میں فارسی گویوں کا بول بالا تھا۔ ہندستان ہی نہیں، افغانستان اور ایران تک کے معروف فارسی شعرا ہندستان کی سرزمین پر دادِ سخن دے رہے تھے۔ اس دور میں اردو اہلِ دہلی کے درمیان کہاں ہے، اس کی تلاش کے لیے تین اجزا بے حد اہم ہیں۔ (۱) دکنی شاعری کا دہلی پہنچنا (۲) فارسی گویوں کا اردو کی طرف ملتفت ہونا اور (۳) ایہام گو شعرا کا تیزی سے اُبھرنا۔ یہ واقعات ایک ہی وقت میں، ایک ہی جغرافیائی ماحول میں ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ان تینوں کے درمیان کوئی باہمی تعلق ہے یا نہیں۔ قرائن واضح کرتے ہیں کہ ان کے بیچ کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ تاریخِ ادب کے طالب علم کو ان معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عہدِ محمد شاہ میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ فارسی کے دو ایسے بڑے شاعر موجود ہیں جن کی اردو گوئی ثابت ہے۔ شاہ جہاں کے دور تک ابوالفضل، فیضی، عرفی، نظیری، صائب، قدسی اور کلیم جیسے شعرا دربار سے وابستہ تھے اور مغلیہ سلطنت کے عروج کے ساتھ ان کی فارسی گوئی بھی تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی لیکن اورنگ زیب کے وصال کے ساتھ فارسی کا زور گھٹنے لگا، یہی زمانہ ہے جب دہلی میں اس عوامی زبان کی طرف جھکاو بڑھا۔ جس کی واضح مثال آرزو اور بیدلؔ ہیں۔ جن کے پاس ایسے شاگرد موجود تھے جو اردو گوئی کی طرف آنا چاہتے تھے۔ دہلی میں اردو شعرا کی پہلی نسل واقعتاً انھیں فارسی گو اساتذہ کی آغوشِ تربیت میں پلی ہوئی ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں دہلی میں جن شعرا پر ہماری سب سے پہلے نظر پڑتی ہے، اُن میں صفِ اوّل ایہام گو شعرا کی ہے۔ فارسی گوئی سے الگ ہونے کا یہ ایک لسانی حربہ بھی ہے۔ شاید ان پر ولی سے متاثر ہونے اور اس کا بھونڈے طور پر استعمال کرنے کا بھی الزام عائد ہوا لیکن وہ شاعری کو ایک لسانی کھیل تماشا بنا کر اس کے وسیلے سے اپنے عہد کی بوالعجبیوں کو پیش کر رہے تھے۔ فائز، آبرو، ناجی، یک رنگ، مضمون، فغان، تاباں جیسے ایہام گو شعرا میں وہ قوت ضرور ہے جس سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی۔ ایہام گویوں کے یہاں معاشرتی زوال کے اثرات سب سے زیادہ ہیں۔ ہند مغل تہذیب جس بڑے پیمانے پر شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی، اس دور کے شعرا اس سے الگ کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ بولیوں کے وہ شعرا جو گذشتہ دور میں بھکتی تحریک کے زیرِ اثر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکے تھے، اب اس کو کائی تازہ سلسلہ دہلی میں موجود نہیں تھا۔

تاریخ کے اس موڑ پر دہلی کی شاعری کی سب سے طاقتور نسل سامنے آتی ہے۔ ناقدین نے اسی زمانے کو اردو کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

عہد زریں قرار دیا ہے۔ اس نسل کے پہلے دستے میں ایہام گویوں کی بزم سے ابھرے شاہ حاتم اور مرزا مظہر اور اُن کے دوسرے شاگرد ہیں جنھوں نے اصلاح زبان کی تحریک کی داغ بیل رکھ کر ایک ایسا نیا سلسلہ چلایا جس سے ایہام گوئی دہلی سے تمام ہوگئی۔ اسی قبیل میں انعام اللہ خان یقین جیسے نوجوان شاعر بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن درد، میر، سودا، سوز اور میر اثر جیسے شاعروں کی نسل نے دہلی میں اردو شاعری کے کارواں کو بہت وسعت اور بلندی بخشی۔ نظیر اکبر آبادی الگ سے دہلی میں اردو شاعری کے ماحول کو نیا ذائقہ بخش رہے تھے۔

اردو شاعری کے اس عہد زریں کو سیاست اور سماج کی طرف سے کوئی تعاون نہیں تھا۔ سلطنتِ دہلی کے فرمارواں معذور و مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں آخری نصف تو شاہ عالم ثانی کا دور ہے جس کی بادشاہت کا علاقہ ''از دہلی تا پالم'' قرار دے کر لوگ مذاق اُڑاتے تھے۔ ایسے میں اردو شاعروں اور ادیبوں کو حکومت سے کوئی معاونت نہیں مل رہی تھی۔ میر کی زندگی کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے وہ دہلی اور اس کے مضافات میں مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے مقصد سے کم از کم 25 سفر کر چکے ہیں۔ اسی مرحلے میں لکھنؤ کے نوابین سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد اور پھر لکھنؤ اردو داں حلقے کے لیے ایک پرکشش مرکز بن جاتے ہیں۔ تلاشِ معاش میں شاعروں اور ادیبوں کو جائے اماں چاہیے اور اسی لیے دہلی سے بڑی تعداد میں لکھنے والے اودھ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اودھ کی راہ لینے والے پہلے قابل ذکر شاعر فغاں ہیں۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی سودا اور جعفر علی خاں حسرت جیسے شاعر بھی فیض آباد پہنچ جاتے ہیں۔ میر ضاحک بھی سب سے پہلے اودھ آنے والوں میں گنے جاتے ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے میں 1781 سے 1782 تک میر بھی تلاشِ معاش میں لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ انشا اللہ خاں انشا، مصحفی اور میر حسن سب دہلی سے لکھنؤ میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور انھیں دہلوی تارکینِ وطن سے قائم ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمارے پاس زیادہ اطلاع نہیں کہ اُن شاعروں سے پہلے لکھنؤ میں اردو کی کون سی سرگرمیاں تھیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان میں سے اکثر شعرا لکھنؤ بڑھاپے میں آئے۔ اس کی وجہ سے اُن کی شاعری ایک خاص مقام تک پہنچ کر لسانی اور ادبی مزاج میں پختگی حاصل کر چکی تھی۔

لکھنوی شاعری کا واقعتاً دورِ دوم عروج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کم عمر کی دہلوی نسل تو ہے ہی، بعض ایسے شاعر بھی ہیں جو دہلی کے عمومی مزاج سے الگ اپنا انداز رکھتے تھے۔ جرأت، انشا، مصحفی اور میر حسن ایسے شاعروں میں اوّلیت رکھتے ہیں جن سے لکھنؤ میں علاحدہ قسم کے شعری اسلوب کی بنیاد پڑی۔ جرأت بیان کی رنگینی اور معاملہ بندی اور میر حسن تہذیب کی پاسداری کی وجہ سے لکھنؤ میں دو علاحدہ انداز کی بنیاد رکھنے والے فن کار قرار پائے۔

اٹھارویں صدی کے درمیانی عہد کو نظر میں رکھیں تو ناسخ اور آتش کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ ناسخ، مصحفی کے شاگرد ہیں، لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں خاص کر میر اوسط علی رشک کے ذریعہ زبان کی ایک علاحدہ معیار سازی کی کوشش کی۔ لکھنؤ کے یہ دونوں اساتذہ حلقۂ شاگرداں کے معاملے میں بے حد خوش نصیب ہیں۔ ان لوگوں نے دہلی سے الگ زبان کے سانچے کو

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Engineering Technologies

تیار کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ آتش کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔ ناسخ اور اُن کے شاگردوں نے قواعد اور قوانین پر جتنا وقت لگایا، اس کے حساب سے تخلیقات کے تئیں اُن کی توجہ نہیں رہی۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مرثیوں کا بھی بڑا فروغ ہوا۔ میر ضمیر اور خلیق نے جس چراغ کو روشن کیا تھا، اسے ان کے بعد کی نسل نے آفتاب بنا دیا۔ انیس اور دبیر کا دور اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ لکھنؤ میں مثنویوں کے ساتھ ساتھ جس طرح مرثیوں کا فروغ ہوا، وہ اردو شاعری کا علاحدہ باب ہے۔ دہلی کی بزم میں اردو نثر کی طرف کم توجہی تھی، لیکن اہالیان لکھنؤ نے داستان نویسی کو آزمانے کی کوشش کی۔ (نوطرز مرصع) عطا حسین خاں تحسین، (فسانہ عجائب)، (شرار عشق) اور (شگوفۂ محبت) رجب علی بیگ سرور اور (بستانِ حکمت) فقیر محمد گویا اسی عہد کے اہم قصہ گو ہیں۔ (رانی کیتکی کی کہانی) اور (دریائے لطافت) بھی انشاء اللہ خاں انشا اسی خاک سے برآمد ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے کئی مصنفین میر شیر علی افسوس اور مرزا علی لطف لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

اردو کی ادبی تاریخ میں پرانی تنقید کے حوالے سے دہلی اور لکھنؤ کے مراکز کے زیر اثر لکھے گئے ادب کو بعض اوقات ایک دوسرے کے مقابلے کھڑا کیا گیا اور اسی سے دبستانی اختلافات کا فروغ ہوا۔ رفتہ رفتہ ان اختلافات نے ایسی بنیادی شکل اختیار کر لی جس میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا ایک ضد بھی شامل تھی۔ یہ زخم ایسا ناسور بنا کہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو بالکل الگ قسم کا تسلیم کیا جانے لگا یا کم سے کم یہ کوشش ضرور ہوئی کہ دونوں مقامات کی تخلیقات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی کی طرح شعر ادب کی کوئی طویل روایت لکھنؤ میں موجود نہیں تھی۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر سے پہلے لکھنؤ کی ادبی تاریخ میں کوئی بڑی تخلیقی شخصیت دکھائی نہیں دیتی لیکن دہلی کی اُجڑتی بزم کے سامنے لکھنؤ کی چمکتی فضاؤں کی اہمیت زیادہ ہوگئی تھی۔ اسی لیے اہل لکھنؤ کے ذہن میں کہیں یہ بات آئی کہ جب ہوا کا رخ ہماری طرف ہے تو کیوں نہ خود کو تاریخ کا ایک علاحدہ باب قرار دے دیا جائے۔ یہ سلسلہ رجب علی بیگ سرور سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس جذبۂ تفاخر کو غیر فطری کہنا، انصاف کا تقاضہ نہیں ہے اور اسی طرح دبستانِ لکھنؤ کا آزادانہ وجود قائم ہوا۔

اہلِ لکھنؤ نے دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے کلام سے زبان و بیان کے استعمال کے بعض امتیازات کی تشہیر کی۔ زیر بحث بیش تر معاملے ضمنی رہے۔ بعض الفاظ جس پر اہل دہلی جنسیت کے تعلق سے بحث کرتے تھے اور مذکر یا مؤنث دونوں طور پر استعمال کرتے تھے۔ انھیں لکھنؤ والوں نے اس طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جن پر اہلِ دہلی کی اکثریت کاربند نہیں تھی۔ ایسے الفاظ کی فہرست قدرے طویل ہے۔ مثلاً بلبل، طرز، سانس، رتھ۔ اسی طرح تلفظ کے معاملے میں بھی دہلی سے بالارادہ الگ انداز اپنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ تمام الفاظ ویسے ہی تھے جو اہلِ دہلی کے یہاں بھی دونوں طرح سے استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ لفظوں کی سطح پر لکھنؤ اور دہلی کے جس فرق کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا، وہ یقیناً ویسا نہیں تھا۔

ناسخ اور اُن کے شاگردوں نے لکھنؤ میں اصلاح زبان کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا اور اردو میں متروکات کی ایک طویل فہرست جاری کی۔ ہندوی سے گریز اور فارسیت کی طرف استناد کے لیے دوڑنا لکھنؤ کی اس نئی زبان کا طرۂ امتیاز تھا۔ بلاشبہ لکھنؤ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

کے حلقے میں یہ زبان نافذ ہوئی۔ لیکن اس بات کو دہلی سے جس طرح مخالف سمت کا معاملہ سمجھا جاتا ہے، ویسا ہرگز نہیں ہے۔ ناسخ سے تین چوتھائی صدی پہلے دہلی میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کے شاگردوں نے جو ایہام گویوں کے خلاف تحریک چلائی، اس کے اغراض و مقاصد بھی ہندوی سے گریز اور فارسیت کی طرف جھکاؤ سے الگ کیسے تھے؟ دہلی میں بھی متروکات کی ایک فہرست جاری کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ ایک ہی طرح کی اصلاح زبان کی تحریک چلی۔ اتفاق سے دونوں کے نتائج یکساں رہے۔ ان کے بعد کی نسلوں نے اس لسانی منشور (Linguistic Manifesto) پر کچھ خاص توجہ نہ دی اور اسی وجہ سے ان دونوں اصلاحِ زبان کی تحریکوں سے کوئی قد آور ادبی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ میر اور سودا، مرزا مظہر جان جاناں سے الگ رہے، اور آتش یا دیا شنکر نسیم حلقۂ ناسخ سے علاحدہ ہے۔

لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں ایک اور بنیادی فرق داخلیت اور خارجیت کو بتایا جاتا ہے۔ عمومیت پسند قدیم ناقدین نے بتایا کہ دہلی کی شاعری میں داخلیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی کی فضاؤں میں اہلِ تصوف کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے ماحول میں عیش پسندی اور تصنّعات کی فراوانی تھی۔ دونوں دبستانوں کی شاعری میں بالعموم یہ فرق ہے۔ لیکن دونوں جگہ کے اچھے شاعروں میں فرق کی دوری کم سے کم ہے۔ یوں بھی خارجیت اور داخلیت کو جتنی آسانی سے بلکہ الگ الگ مان لیا جاتا ہے، واقعتاً ان کا اس طرح علاحدہ وجود ہوتا نہیں۔ داخل اور خارج کا ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا نے بھی جن پر خارجیت کی تہمت ہے، عشق و عاشقی کے گہرے تجربے بیان کیے ہیں۔ آتش کی مثال سامنے ہے جنھیں داخلیت ہی نہیں، متصوفانہ گھنی چھاؤں بھی پسند آتی ہے لیکن اسی کے مقابلے دہلی میں تمام ایہام گو اور اُن سے پہلے جعفر زٹلی کس چیز کے شیدا تھے؟ ایسے ہی خارجیت اور داخلیت کو بنیادی خصوصیت مانتے ہوئے لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کو کیسے الگ الگ کیا جاسکتا ہے؟ جس شاعر کی نگاہ جتنی گہری ہوگی، وہ اسی قدر موضوع کے تن بدن میں اندر تک جائے گا۔ یہی خارج یا ظاہر سے داخل اور باطن کا سفر ہے اور اس میں دہلی اور لکھنؤ کے درمیان آخر کیوں فرق ہونا چاہیے؟

شعر و ادب سماجی اور سیاسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کا نبض پیما ہوتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین، دہلی اور لکھنؤ دبستان کے فرق کو نہیں مانتے۔ ان کی توضیح ہے کہ جب دونوں کا معاشی اور سیاسی ماحول بہت بدلا ہوا نہیں تھا تو کیسے ان جگہوں کے ادب میں کوئی بنیادی فرق آجائے گا۔ دونوں زوال کی پرچھائیوں میں قید ہیں اور ان سے نجات کہیں نہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بعض شعرا اور ناقدین نے لکھنؤ اور دہلی کے شعر و ادب میں دوریاں ڈھونڈنے کا منصوبہ بند کام کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اس تنازعے کو سنجیدگی سے دیکھنے کی روش عام ہوئی، تب دونوں دبستانوں کے نقطۂ اتصال کی تلاش شروع ہوئی۔ احتشام حسین کی بات اس وجہ سے معنی رکھتی ہے کیونکہ وہ خود اسی لکھنؤ کی خاک سے اُٹھے تھے۔ حلقۂ لکھنؤ کے ایک اور فرزند علی جواد زیدی نے ''دو ادبی اسکول'' کتاب لکھ کر سیکڑوں مثالیں فراہم کیں اور کہا کہ یہ ''نام نہاد'' اسکول ہیں اور دہلی سے لکھنؤ کے بیچ ادبی دوری اتنی کبھی نہیں رہی جس قدر وہ دکھائی جاتی ہے۔ یہ ماننا سب سے زیادہ صحیح ہوگا کہ دہلی اور لکھنؤ تاریخِ ادب کے دو پڑاو ہیں لیکن ادب کا سلسلۂ خیال اس سے پہلے سے بھی چلتا رہا ہے اور اس کے بعد بھی چلتا رہے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies

گا۔دو مقامات اور تاریخوں کے درمیان جو فرق ہوتے ہیں، وہ بنیادی نوعیت کے کم ہوتے ہیں۔انفرادی معاملے میں فرق فطری ہے۔لکھنؤ اور دہلی دبستانوں کا تنازعہ اسی نقطۂ نظر سے حل کیا جاسکتا ہے۔

مختصر گفتگو

۱۔ دہلی میں اردو شعرا کی پہلی نسل کن فارسی گو اساتذہ کی آغوش میں پلی؟
۲۔ وہ کون سے ایہام گو شعرا ہیں جن سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی اور کیوں؟
۳۔ اٹھارویں صدی کی اہم مثنویوں اور مثنوی نگاروں کی فہرست بنائیے؟
۴۔ لکھنؤ کی اہم نثری تصانیف اور ان کے مصنفین کے نام بتائیے؟
۵۔ اردو شاعری کا عہدِ زرّیں کس عہد کو کہا جاتا ہے اور کیوں؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں بنیادی فرق کیا ہے؟
۲۔ دہلی میں شعر و ادب کے ارتقا پر ایک تبصرہ کیجیے۔
۳۔ لکھنؤ میں شعر و ادب کے ارتقا کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔
۴۔ ادبی اسکول سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ لکھیے۔
۵۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے پانچ پانچ شعرا کے نام لکھیے اور ان کے بارے میں دو دو جملے لکھیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

عظیم آباد کی ادبی سرگرمیاں

اردو کی ابتدا سے متعلق تحقیقات میں مختلف طرح کی پیچیدگیاں ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ شعروادب کے دو بنیادی مراکز میں، اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب کے ارتقا کا سفر یہ ثابت کرتا ہے کہ ان دونوں مقامات میں یہ زبان خوب پھلی پھولی۔ تاریخی طور پر دکن کو بھی دبستان ماننا اس لیے موزوں ہے کیوں کہ اس علاقہ میں اردو نہ صرف ابتدائی دور میں ترقی پاسکی بلکہ ملاّ وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی، سراج جیسے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھیں اردو کی ادبی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے۔ اِن تین ادبی مراکز کی بنیاد پر اردو قومی سطح کی زبان نہیں بن سکتی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ قطب شاہی اور عادل شاہی، مغلیہ اور نوابین اودھ کی سلطنتوں نے اردو زبان اور ادب کی پرورش و پرداخت میں جتنی بھی مشقت کی ہو لیکن صرف انھیں کے بل بوتے پر اردو کو قومی زبان نہیں بننا تھا۔

عظیم آباد، رام پور، آگرہ اور مرشد آباد ایسے ادبی مراکز ہیں جنھیں دکن، دہلی اور لکھنؤ کے بعد دوسری صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ مرکزی حکومت کے بکھراو اور زوال کے ساتھ کچھ اس طرح کے خود مختار ادارے اور مراکز اپنے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ کسی بڑھنے اور پھیلنے والی زبان کے لیے یہ ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ مراکز سے دور آبادیوں تک جائے۔ دہلی اور لکھنؤ سے دور اردو کے یہ مراکز اس زبان کی توسیع کا ایک حصّہ ہیں۔ عظیم آباد کو یہ سہولت حاصل رہی کہ وہ لکھنؤ اور مرشد آباد کے بیچ میں آباد ہے اور دہلی کے طرح ہی اہلِ تصوّف کا کئی صدیوں سے گہوارہ رہا ہے۔

جب اردو ایک زبان کے طور پر نہیں ابھری تھی اور آدھے ادھورے جملے یا چند الفاظ تک اس کی بساط تھی، اس عہد کا تذکرہ مولوی عبدالحق کی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاے کرام کا حصّہ'' میں درج ہے، شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی عبدالحق نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک اس علاقہ میں اردو استعمال میں آنے والی زبان بن چکی تھی۔ ظہورالدین ظہور، محمد تقی بلخی شاہ، عطا حسین منعمی، سیّد محمد اسحاق جیسے صوفیِ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کی خدمات اردو زبان و ادب سے متعلق رہی ہیں۔ انھیں کی بدولت بہار میں دورِ اوّل میں اردو کا فروغ ممکن ہوسکا۔ عظیم آباد کے دبستان بننے کے کئی اسباب ہیں۔ یہ علاقہ کئی صدیوں سے علما، شعرا و ادبا کا مرکز رہا ہے۔ سیّد حسن عسکری نے بہار کے ان سیکڑوں صوفیا کی تلاش میں کامیابی پائی ہے جو آٹھویں نویں صدی عیسوی سے لے کر مغلوں کے زمانے تک بہار میں مختلف مقامات پر دکھائی دیتے ہیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

حاجی پور میں قاسم حاجی پوری، راج محل کے پہاڑی علاقے میں مرزا عبدالقادر بیدل جیسے شعرا کا موجود ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی گوئی بہار کے گوشے گوشے میں ایک حقیقت تھی۔ صوفیا کی تعلیم اور فارسی شاعروں اور ادیبوں کی تربیت نے ہی بہار میں اردو کے لیے ایک ایسا ماحول تیار کر دیا کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد ادبی دبستان کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

عظیم آباد کس طرح دبستان بنا، اس کی ایک مثال اردو کی ممتاز داستان 'باغ و بہار' کے مصنف میر امن کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ میر امن دہلی والے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دلّی کے اجڑنے کے بعد وہ لکھنؤ پہنچے۔ پھر کئی برس عظیم آباد میں رہے۔ یہیں سے انھوں نے کلکتے کا رخ کیا اور فورٹ ولیم کالج کی نوکری پر معمور ہوئے۔ محققین نے تخمیناً میر امن کی عظیم آباد میں رہائش کو 27-26 برس بتایا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میر امن کے ذاتی احوال کے متعلق خاموش ہے۔ اس لیے یہ بتانا تقریباً ناممکن ہے کہ میر امن اس دوران عظیم آباد میں کیا کر رہے تھے لیکن اس سچائی سے انکار کیسے کیا جائے کہ میر امن کی ادبی تربیت میں عظیم آباد کی ادبی محفلوں کا بھی حصّہ رہا ہے۔

پروفیسر اختر اورینوی اور مظفر اقبال کی گراں قدر تحقیقات نے بہار میں اردو کی نشو و نما کے تعلق سے اچھا خاصا مواد جمع کر دیا ہے۔ مذہبی اور علمی نثر، قدیم شاعری، ناول اور افسانہ، ان مختلف صورتوں میں اہلِ بہار کی فتوحاتِ علمی ان کتابوں سے اجاگر ہوتی ہے۔ اگر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کو ہی بنیاد مانیں جب دبستانی فتوحات کو اہمیت حاصل تھی، اس زمانے میں جوشش، مرزا محمد فدوی، غلام علی راسخ عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، شاہ آیت اللہ جوہری، عمادالدین پھلواروی، رام نارائن موزوں، دلدار، رضا عظیم آبادی، شورش، عشقی، علی ابراہیم خاں خلیل ایسے صاحبِ کمال موجود رہے ہیں۔ کسی ایک خطّے میں ایسا اجتماع یہ ثابت کرتا ہے کہ عظیم آباد اس دور میں علم و فن کا گہوارہ بن چکا تھا۔

غدر کے بعد جس طرح دلّی اور لکھنؤ میں انتشار کی فضا قائم ہوئی، اس مرحلے میں شہر عظیم آباد اردو کی ترقّی میں ایک جائے اماں بن کر ابھرا۔ دلّی کے ایسے کئی شعرا ہیں جنھیں عظیم آباد میں اس پیغمبری وقت میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ اشرف علی خاں فغاں، مہاراجا کلیان سنگھ عاشق، مرزا محمد علی فدوی، شاہ رکن الدین عشق، محمد باقر حزیں اور میر ضیا جیسے اصحاب دہلی کے اجڑنے کے بعد عظیم آباد کی خاک میں ہی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہی وہ موقع تھا جب عظیم آباد نے اپنی انفرادی شناخت کا مقدمہ پیش کیا۔ 1846 میں جب شاد کی پیدائش ہوئی اور رفتہ رفتہ اُن کی شہرت لکھنؤ اور حیدرآباد تک پھیلنے لگی تو یہ موقع تھا کہ عظیم آباد کو دبستان کے طور پر پہچان ملے۔ حالاں کہ یہ دور دبستانی امتیازات کے ختم ہونے اور ملک گیر سطح پر اردو کے عمومی رجحان سے عبارت ہے۔ لیکن دلّی اور لکھنؤ کی مقابلہ آرائی میں عظیم آباد نے ایک متوازن اور بعض اوقات فیصلہ کن رویہ اپنایا۔ بعض ناقدین جس آسانی سے یہ بات کہہ لیتے ہیں کہ عظیم آباد دلّی اسکول کی توسیع ہے، شاید وہ اپنی بات جلد بازی میں کہتے ہیں۔

عظیم آباد کا ادبی اسکول اصل میں دلّی اور لکھنؤ کی ادبی اجارہ داریوں کے خلاف ایک توازن اور اعتدال کی طرف بڑھتا ہوا قدم تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اہلِ دلّی اور لکھنؤ جس طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے، عظیم آباد نے اس کے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

خلاف توازن کا ادبی پیمانہ وضع کیا۔ شاد عظیم آبادی اس ادبی رواداری کے نمایندہ بن کر ابھرے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ لکھنؤ اور حیدرآباد تک کی محفلِ مراثی میں شاد عظیم آبادی اہمیت کے ساتھ بلائے جاتے تھے۔ اور دبیر ایک زمانے تک عظیم آباد کی محفلوں میں مرثیہ پڑھنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ دبیر کے صاحب زادے مرزا صاحب اوج اور داغ دہلوی، داغ کے داماد سائل جیسے شعرا عظیم آباد کی طرف اس وجہ سے توجہ کر رہے تھے کیوں کہ وہ دلّی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ اسے ایک بڑا ادبی مرکز تصوّر کرتے تھے۔ دلّی نے جو لسانی معیار بندی اور لکھنؤ نے ہندوی اندازِ نظر کو فروغ دیا تھا، عظیم آباد نے اسے یکجا کر کے ایک ایسا لسانی تجربہ کیا جو اردو کا مستقل لہجہ بنا اور شاد عظیم آبادی نے یوں پیش کیا :

نمک ہے فارسی کا، درد ہندی شاعری کا ہے
یہ اردو ہے معلّا نکتہ سنجانِ عجم دیکھیں

عظیم آباد کا ادبی اسکول اسی شعر کی ترجمانی اور اسی ادبی رویّے کو عام کرنے کے لیے اردو میں مستقل اہمیت کا حامل بنا۔

مختصر گفتگو

۱۔ بہار میں دورِ اوّل میں اردو کو فروغ دینے والے صوفیۂ کرام کے نام لکھیں۔
۲۔ دبستانِ عظیم آباد سے تعلّق رکھنے والے آٹھ شاعروں کے نام قلم بند کریں۔
۳۔ عظیم آباد سے میر امّن کے تعلّق پر ایک نوٹ لکھیں۔
۴۔ عظیم آباد دبستان سے تعلّق رکھنے والے بیسویں صدی کے دس شعرا کے نام لکھیے۔
۵۔ جمیل مظہری کے چار اشعار زبانی یاد کر کے لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ دبستانِ عظیم آباد کے وجود میں آنے کے اسباب کیا ہیں؟ مفصّل لکھیں۔
۲۔ دلّی اور لکھنؤ کی ادبی اجارہ داریوں کے خلاف دبستانِ عظیم آباد توازن اور اعتدال کی مثال پیش کرتا ہے۔ اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔
۳۔ شاد عظیم آبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

علی گڑھ تحریک

سرسیّد کی رہنمائی میں علی گڑھ کا تعلیمی تجربہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن وفکر اور عمل میں ایک انقلاب کا اشاریہ ہے۔ اپنی حکومت کے چھن جانے اور انگریزوں کی غلامی کی چکّی میں پستے ہوئے سماج کو سرسیّد نے تعلیم کے مغربی طوفان سے مقابلے کا ایک نسخۂ کیمیا عطا کیا تھا۔ روایت کی جکڑ بندیوں اور مذہب کے حصار کو پار کیے بغیر تعلیم کے نئے منظرنامے کی طرف نہیں آنا تھا، سرسیّد اس سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے صرف مغربی تعلیم کے پیمانے چھلکانے پر اکتفا نہیں کیا۔ تہذیب، ثقافت، مذہب، ادب، سیاست، عورتوں کے مسائل، پیشے ورقوموں کی بہتری کے بارے میں غور وفکر، انگریزوں سے تعلّق، معاشرۂ قدیم کے بارے میں ایک نیا تصوّر اور ہم وطن برادران سے شیر وشکر ہونے جیسے مختلف فیہ اور گوناگوں مسئلوں کی بنیاد پر انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات پیش کیے۔ یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ علی گڑھ تحریک یا سرسیّد کو صرف مغربی تعلیم کو مقبول بنانے میں محدود کر کے اس کے بے پایاں اور وسیع پیمانے پر فیضان کے سلسلے سے ان دیکھی کرتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک ایک دن میں قائم نہیں ہوئی اور نہ سرسیّد ایک دن میں اس تحریک کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر سکے۔ سرسیّد کے پاس کوئی جادو کی چھڑی بھی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ معاشرے کو بدل دینا اتنا آسان بھی نہیں۔ اس لیے انھوں نے مستحکم تیاری کی۔ علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پہلے سرسیّد کی علمی اور سماجی حیثیت کا اعتراف ایک عالَم کرنے لگا تھا۔ ان کے پاس کارپردازوں اور اپنے ہی جیسے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے والے بڑی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ اہالیانِ وقت سے ربط کا سلسلہ بھی چل چکا تھا۔ غدر کے بعد سرسیّد کے نقطۂ نظر میں یہ مثبت تبدیلی آئی تھی کہ اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے جگائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ انگلستان کے سفر نے سرسیّد کے خوابوں کو واضح شکل عطا کرنے کے لیے آخری پتھر کا کام کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسٹی یا اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر نے ان خوابوں کو اس طرح تعبیر کی رداعطا کی کہ انگلینڈ سے لوٹتے ہی رسالے سے لے کر کالج اور یونی ورسٹی کے بارے میں فیصلے شروع ہو جاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے پانچ برس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (Mohammedan Anglo Oriental College) قائم ہو جاتا ہے۔

یونی ورسٹی یا کالج سے پہلے سرسیّد نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس سے پہلے ''آثارالصنادید'' اور ''اسباب بغاوتِ ہند'' جیسی بیش قیمت کتابیں سرسیّد پیش کر کے لوگوں کی داد لے چکے تھے۔ اپنے خیالات اور تصوّرات کی بنیاد پر یونی ورسٹی قائم ہونے سے پہلے ہی سرسیّد ایک نئے مکتبِ فکر کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ اس زمانے کی بڑی شخصیات

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

میں غالب، امام بخش صہبائی، رجب علی بیگ سرور، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک جیسے لوگوں سے سرسیّد کا ربط ان کی شخصیت کی وسیع المشربی کا اشاریہ ہے۔ سرسیّد کے حلقے میں علم الحساب سے لے کر تاریخ وجغرافیہ تک اور سائنس سے لے کر شعروادب تک ہر طبقے کے لوگ اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے۔ علی گڑھ تحریک ہندستانی مسلمانوں کے ذہن پر اس لیے اثر انداز ہوئی کیوں کہ ان کے ذہن وفکر میں پیدا ہورہے سارے سوالوں کا جواب اس تحریک کے پاس ہے۔ سرسیّد کی کامیابی کے پیچھے ان کے رفقا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

1857 کے بعد اس انقلاب کے تجزیے کا مشکل کام تھا۔ سرسید نے مغربی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو آواز دی۔ ان کی کوششوں سے ہندستانی مسلمانوں کے اعلا طبقے میں جدید تعلیم کے لیے جو جذبہ پیدا ہوا، اس نے برادرانِ وطن سے آگے یا مساوی مقام تک رکھا۔ تقسیمِ ملک تک نوکریوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد، سرسید کے اجتہاد کا اثر ہے۔ اگر سرسیّد نے مذہبی روایات اور محدود معاشرت کے بھنور میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی جانب راغب کرتے ہوئے علی گڑھ کالج کا آسمان نہیں فراہم کیا ہوتا تو ہندستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کا تناسب شاید صفر کے آس پاس رہتا۔

سرسیّد اس زمانے کے سماجی اور مذہبی مسئلوں پر بھی اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ 1857 سے ہی ہندستان میں یہ سلسلہ چل پڑا تھا کہ انگریزوں کو کیسے ملک سے باہر کیا جائے۔ سرسیّد انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اس ملک میں رکھنے کے طرف دار نہیں تھے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی وقت آئے گا کہ ہم ہندستانی اپنے ملک کا خود قانون بنائیں لیکن فوری طور پر ان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انگریز جیسی ترقی یافتہ قوم سے مقابلہ کرنے سے بہتر اشتراک کا پیمانہ بڑھانا اور دنیوی فیوض وبرکات سمیٹنا زیادہ ضروری ہے۔ اسی لیے جب 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress) کا قیام عمل میں آیا تو سرسیّد نے اس کے ساتھ پیہم گزارشات کے باوجود دست تعاون بڑھانے سے انکار کیا۔ گوکھلے اور بدرالدین طیّب جی کے نام سرسیّد کے جو خطوط ہیں، ان سے ان کے سیاسی شعور کا پتا چلتا ہے۔ سرسیّد کی موت تک کانگریس کوئی عوامی یا کل ہند تنظیم نہیں بن سکی تھی اور نہ ہی ہندستانی سیاست کا وہ موڑ آیا تھا جب کانگریس پورے ملک کی ترجمان ہوجائے۔ سرسیّد کے اعتراضات اس وقت تک صحیح تھے اور وہ تنظیم ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کا ضامن نہیں بن سکتی تھی۔ Discovery of India میں جواہر لال نہرو نے سرسیّد کے اس فیصلے کو اس وقت کے اعتبار سے صد فیصد صحیح تسلیم کیا ہے۔ یہ اندازہ کرنے کی بات ہے کہ اگر سرسیّد 1920 کے بعد کانگریس کے عوامی مورچے کو دیکھتے تو شاید سرگرم اشتراک کے لیے خود سے دوڑ پڑتے۔

سرسیّد کے مذہبی تصورات پر بھی اکثر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اپنے زمانے میں انھیں ایک طبقے نے گمراہ تسلیم کیا۔ ان کی تفسیر پر علما نے اچھا خاصا اعتراض کیا۔ ہندستانی معاشرے کو مذہب کا ایک عصری تصور قبول کرنے میں دشواری تھی۔ سرسیّد عقل کے حوالے سے عقیدت کی بزم آرائیوں کو تولنا چاہتے تھے، یہ کام آسان نہیں تھا۔ سرسیّد کی دلیلیں مذہب کے معاملے میں ان لوگوں کے لیے بھی زود ہضم تھیں جنھیں سرسیّد کا رفیق یا ہم نوا مانا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی روایت پرست نہیں تھے لیکن سرسیّد کے تصور کے نکتہ چیں تھے۔ علمائے کرام کی بہت بڑی جماعت تھی جو انھیں 'فسادی مُلّا' کہتی تھی لیکن یہ سرسیّد کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

جگر تھا جس نے تمام حملوں کو جھیلتے ہوئے اپنی عقل اور نقطۂ نظر پر اعتبار جاری رکھا۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہوتا تو ہندستانی مسلمانوں کی بیداری میں سرسیّد کی شخصیت رہنما نہیں بنتی۔

سرسیّد کے زمانے میں فارسی حکومت کی زبان تھی اور عوامی زبان کے طور پر اردو مرکزیت رکھتی تھی۔ سرسیّد کی ابتدائی کتابوں کا تعلق فارسی سے ہے، بعد میں انھوں نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ انھیں معلوم تھا کہ اس زبان کی جدید کاری کیے بغیر وہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن کے بند دروازے اور کھڑکیوں کو نہیں کھول سکتے۔ گل وبلبل اور کاکل محبوب کی پرچھائیں میں اردو زبان جدید عہد تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سرسیّد نے نہ صرف اپنی تحریروں سے اس زبان کے مشتملات بدلنے کی کوشش کی بلکہ مختلف اصناف اور شعبوں کے ماہرین کی ایسی تربیت کی جن سے اردو زبان ایک انقلاب آفریں دور میں پہنچ گئی۔ سرسیّد، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، سرشار، ذکاءاللہ جیسے اصحاب کی ادبی خدمات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سرسیّد کے اُس طرف ایک دوسری اردو تھی اور سرسیّد کے اِس طرف ایک دوسری اردو ہے۔ پہلے کی اردو روایت کے جال میں شکست خوردہ صورت نظر آتی تھی۔ سرسیّد کے بعد کی اردو نئے معاشرے اور نئے تقاضوں کی بنیاد پر ایک زندہ جاوید ادبی سرمایہ ہے۔ شاعری سے نثر کی طرف مراجعت کا بھی پہلا سبق سرسیّد نے دیا تھا۔ یہ سوچ کر آج خوف آتا ہے کہ سرسیّد نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر اردو زبان وادب کے مقدر کو نئی شکل عطا کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاعری کے علاوہ ہمارے ہاتھ خالی ہوتے۔

ایسا نہیں ہے کہ سرسیّد علمی اعتبار سے اپنے رفقا کی خدمات کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تاریخ، تہذیب، مقالہ نویسی، صحافت اور خطبہ نگاری کے شعبے میں سرسیّد نے خود بھی بڑی تعداد میں تحریر وتصنیف کا کام انجام دیا۔ اسماعیل پانی پتی نے سرسیّد کے لکچروں کا مجموعہ تیار کیا تو اس کے دفتر تیار ہوگئے۔ سرسیّد کی تحریروں میں انگریزی لفظوں کی بہتات اور 'کرکر' کی تکرار آج ہمارے ذہنوں پر بوجھ ہیں۔ لیکن ہر ابتدائی کام کرنے والے کے یہاں یہ بے احتیاطی لازم ہے۔ اس کی وجہ سے سرسیّد کی تصنیفی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

زندگی کے مختلف شعبوں کے تعلق سے سرسیّد کی خدمات کا جائزہ لیتے وقت ہماری آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں کہ ایک شخصیت کے اثر سے قوم کے سیاہ وسفید کیسے بدل گئے۔ یہ تبدیلی صرف تعلیم اور تہذیب کے شعبے میں نہیں ہوئی بلکہ شعروادب کے حلقے میں بھی انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدید ہندستان کے طول وعرض پر جب نظر ڈالتے ہیں تو سرسیّد جیسی کوئی دوسری شخصیت ہمیں نہیں ملتی جس نے ملک وقوم کو ہزار طریقوں سے متاثر کرنے کا فرض ادا کیا ہو۔ علی گڑھ تحریک ایک شہر کی تحریک نہیں تھی اور نہ سرسیّد محض ایک شخصیت تھے۔ نئے ہندستان کی تعمیر کا خاکا کہ سرسیّد کی رہنمائی میں علی گڑھ میں تیار ہوا، اسی میں ہم آج تک رنگ بھر کر روشنی اور چمک پیدا کررہے ہیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

مختصر گفتگو

۱۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر واضح کیجیے۔
۲۔ سرسیّد کے نامور رفقا کی فہرست بنائیے۔
۳۔ جواہر لال نہرو نے سرسید کے کس فیصلے کو درست قرار دیا تھا؟
۴۔ سرسیّد نے کن خاص علوم میں اپنے جوہر دکھائے؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات واضح کیجیے۔
۲۔ سرسیّد کی تعلیمی کوششوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔
۳۔ سرسیّد کے سیاسی نظریات پر اپنی رائے ظاہر کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

ترقّی پسند ادبی تحریک اور اس کے اثرات

اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک نے پہلی بار ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک مقام پر جمع کر کے ان کے ادبی اعتقادات کی قومی اور بین الاقوامی ترجمانی کا خواب دیکھا تھا۔ ان معنوں میں یہ پہلی تحریک تھی جس کے پیچھے ارادوں کا دخل ہو۔ اِس کے قبل اردو میں جو تحریکیں سامنے آئیں، وہ غیر ارادی طور پر ابھر گئی تھیں۔ ایہام گوئی، اصلاحِ زبان، فورٹ ولیم کالج۔ ان تینوں تحریکوں میں اس زمانے کے لکھنے والوں کے اجتماعی ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ علی گڑھ تحریک ادبی فروغ کے مقصد سے نہیں کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ مانا جاسکتا ہے کہ یہ بھی اپنے آپ پیدا ہوئی ادبی تحریک بن گئی لیکن ترقّی پسند تحریک دنیا بھر میں مخصوص مقاصد اور نشانوں کو نظر میں رکھ کر شروع کی گئی تھی۔

اردو میں جب اس تحریک کا آغاز ہو رہا تھا، اُس وقت بھی اس کے اغراض و مقاصد واضح تھے۔ ہندستان کی قومی تحریک سے بھی ترقّی پسند تحریک نے ربط باہمی کا سلسلہ رکھا اس لیے فوری طور پر یہ اپنی مقبولیت کے عروج تک پہنچ گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 1950 کے بعد اِس تحریک نے زوال کی طرف رُخ کیا اور اُسی دہائی میں جدیدیت کے فروغ کے پہلے اِس نے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔ اس کے باوجود بعد کے ادب میں بھی ترقّی پسندانہ نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ ادب کے طالب علم کے لیے یہ سوال کافی اہم ہے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ادب کا جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ واقعتاً ہمیں اس تحریک نے کیا دیا؟ اسی سوال کا دوسرا منطقی پہلو یہ ہے کہ اُن امور کی نشاندہی کی جائے کہ ترقّی پسندی جن تصوّرات اور نظریوں کو لے کر آگے بڑھی تھی، کیا اردو پر ان کے دائمی اثرات مرتب ہوئے؟ ترقّی پسند ادیبوں اور شاعروں نے جو نئے تجربے کیے، کیا انھیں بعد کی نسلوں نے اپنے لیے رہنما تصوّر کیا؟ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ترقّی پسندی آج بھی اردو ادب میں رویّے کے طور پر زندہ ہے تو یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ موجودہ ادبی سرمایے کے تناظر میں بھی ترقی پسندانہ تصوّرات کی موجودگی کا محاسبہ کیا جائے۔

اردو میں ترقّی پسندی اوّلاً اقبال، پریم چند اور انگارے کے افسانہ نگاروں کے طفیل اپنی بنیاد استوار کرتی ہے، ترقّی پسندی کے بڑے سوالات انھیں لوگوں نے ابتداً اٹھائے تھے۔ اقبال نے عالمی تناظر، مذہبی اداروں کے خلاف ردِّ عمل اور ادب، سیاست، مذہب میں رشتے کی بات سامنے لادی تھی۔ پریم چند نے کسان اور مزدور کی مرکزیت، دیہی سماج اور شہری سماج کے مناظرے، زبان کی سطح پر عوام کی طرف جھکاو اور کمزور لوگوں کی طرف داری جیسے بالکل نئے سوالات ہندستانی ادب میں قائم کیے۔ 'انگارے' کے مصنفین نے آزادیِ اظہار، عورت اور مرد کے رشتوں کی وضاحت اور آزادیِ نسواں جیسے اہم معاملات کو

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

مرکزیت عطا کر کے ادبی آسمان کو مزید وسیع کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک انھیں بنیادوں پر قائم ہوئی۔ مختلف اصناف میں اہم لکھنے والوں کی بہترین نگارشات کے دائرۂ کار کا واضح تعین کیا جائے تو بہت کم ان سے الگ نوعیت کے سوالات کھڑے ہوں گے۔ بعد کے ادبی سرمائے پر غور کریں تو یہ موضوعات مزید اہمیت حاصل کر لیتے ہیں کیوں کہ ان میں سے بیش تر کی موجودگی جدیدیت اور مابعد جدید دونوں زمانے میں رہی۔

ادبی اور سماجی موضوعات پر اردو کے علمی حلقے میں نرم گرم بحثوں کا جو سلسلہ ہنوز قائم ہے، اس کی پشت پر ترقی پسندوں کی گہری تربیت کا اثر ہے۔ 1936 سے 1950 تک ادبی رسائل میں جو گہما گہمی رہی، وہ ترقی پسندی کے ختم ہونے کے باوجود کبھی زائل نہیں ہوئی۔ ادب کیسا ہو، کس طرح لکھا جائے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے، ان جیسے سوالوں پر ترقی پسندوں نے آر پار کی جو بحث شروع کی، وہ ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جدیدیت کے دور میں اور مابعد جدید زمانے تک ان سوالوں پر صرف بڑے لکھنے والوں کے جوابوں پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کا رویہ آج ادبی سماج میں نہیں ہے بلکہ ایک معمولی اور ادبی اعتبار سے غیر اہم لکھنے والا بھی ان سوالوں پر اپنی انفرادی رائے دینا چاہتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کو انسان کی سماجی توقعات کا اشاریہ مانا تھا۔ اسی سے ادب اور زندگی کے گہرے رشتوں کی وضاحت ہو سکی۔ جدیدیت کے زمانے میں حالاں کہ ''ادب برائے ادب'' کو ترجیح دینے کی کوشش ہوئی لیکن رفتہ رفتہ سبھی جدید اہلِ قلم ادب کے سماجی انسلاک کو تسلیم کرنے والے بنے۔ آج جدید اور مابعد جدید تحریروں میں تہذیب و ثقافت اور سماجی مسائل کو بنیادی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے تو اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ ترقی پسند تحریک نے جو سوالات اٹھائے تھے، وہ اب معدوم ہو چکے ہیں۔

ترقی پسندوں کو پریم چند کی زراعتی سوسائٹی روایت میں ملی تھی لیکن راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کو چھوڑ کر دیہاتی سماج کو مرکزیت دینے میں بقیہ لکھنے والوں نے کچھ خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔ ترقی پسندوں نے ایک ابھرتے ہوئے شہری تمدن کی طرف آنکھ لگا رکھی تھی۔ آج ہندستان رفتہ رفتہ شہری سماج بنتا جا رہا ہے۔ نئی آبادیوں اور شہروں کے مزاج سے اردو کا اس کی پیدائش کے وقت سے ایک گہرا تعلق ہے۔ ترقی پسند اہلِ قلم نے اردو کی اس بنیادی سرشت کو پہچانا اور اپنے ادب میں شہری سماج پر خاص توجہ دی۔ گذشتہ نصف صدی میں شہری تہذیب و تمدن کے مظاہر اردو میں سب سے زیادہ آئے۔ اگر دیہات اور شہر کے تنازعے میں ترقی پسند ادیبوں نے واضح فیصلہ نہیں کر دیا ہوتا تو بعد کے لکھنے والوں کے لیے یہ آسان نہیں تھا کہ کسی ایک طرف ہو جائیں۔ ترقی پسند تحریک کا ہی یہ اثر ہے کہ موجودہ اردو ادب شہری تہذیب و تمدن کا عکاس بنا ہوا ہے۔

ہندستان ایک روایتی اور مذہبی سماج رہا ہے جہاں عورتوں کی تعلیم اور ان کے سماجی رول پر بہت دیر سے ہمدردانہ رائے قائم ہوئی۔ لیکن ہندستان کی کسی زبان سے پہلے اردو میں روایتی اور جدید دونوں قسم کی عورتیں سامنے آتی ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو کی ادیبہ رشیدۃ النسا نے اس زمانے میں ''اصلاح النسا'' کے نام سے ناول لکھا جب کتابوں پر مصنفہ کی حیثیت سے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

عورتوں کے نام نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ 'انگارے' میں جب رشید جہاں کا افسانہ اور ڈراما شامل کیا گیا، اس وقت بھی عورتوں کے تعلق سے ہندستان کا سماجی ماحول کچھ خاص بدلا ہوا نہیں دکھائی دیتا لیکن رشید جہاں بالکل ایک نئی دنیا کی خاتون ہیں۔ 1942 میں عصمت چغتائی جب 'دوزخی' اور 'لحاف' لکھتی ہیں تو انھیں محبت سے "لیڈی چنگیز خاں" تک کہا گیا۔ ان کے افسانوں پر مقدمے قائم ہوئے اور گھر کی چہار دیواری میں قید رہنے والی عورت عدالت کے کٹہرے تک پہنچی۔

ترقی پسند تحریک کے تمام کام اگر وقت کی رَو میں ختم ہو جائیں اور صرف اردو کے ادبی منچ پر عورتوں کی طاقت ور شراکت قائم رہ جائے جب بھی ترقی پسند تحریک کے اثرات شاید ہزاروں سال رہیں۔ آج اس پر شاید ہی اختلاف ہو کہ اردو کی سب سے بڑی مصنفہ قرۃ العین حیدر تھیں۔ یہ بدلی ہوئی صورت ترقی پسند تحریک کا احسانِ عظیم ہے۔ آج اردو کی ادیبہ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید عالمی خواتین کانفرنس اور اقوام متحدہ کے مختلف پروگراموں میں نمایندہ بن رہی ہیں تو کیا اسے ترقی پسندوں کی صالح تربیت کا نتیجہ نہیں مانا جائے؟

آزادی کے بعد اردو لکھنے پڑھنے والوں میں مسلمانوں سے الگ دوسری مذہبی آبادیوں نے حصہ لینا کم کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ زبان مسلمانوں کے حلقے میں سمٹ آئی۔ اس کے باوجود مشترکہ تہذیبی وراثت کے موضوع سے اس کے خمیر میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا۔ ترقی پسندوں نے اگر غیر مذہبی بنیاد پر شعر و ادب کی تفہیم کے لیے ماحول قائم نہیں کیا ہوتا تو شاید آج اردو فرقہ واریت کی نقیب بن جاتی۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کی اٹھان اور جارح قومیت (فرقہ واریت) کی شعلگی ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ اگر ترقی پسندوں نے ادب اور سماج کے ان سوالوں پر دور اندیشی سے کام نہیں لیا ہوتا تو آج ہم ایک بدلی ہوئی صورتِ حال سے دوچار ہوتے۔ مذہبِ اسلام کے نام پر ادبی روایتوں اور تحریکوں کی جو کوششیں بیچ بیچ میں ہوئی ہیں، انھیں اردو عوام نے نہ کبھی اہمیت دی اور نہ کبھی زور پکڑنے دیا۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کے ساتھ تعلق قائم کیا تھا۔ قومی تحریک کے آغاز کے بعد تلنگانہ، نکسل باڑی آندولن اور ملک بھر میں چل رہیں تحریکیں اردو کے موجودہ ادب کو متاثر کر رہی ہیں۔ آج کے افسانے اور ناول اِس کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی جو تحریکی اور انقلابی ادب لکھا جا رہا ہے، اہلِ اردو نے اس کا اچھا خاصا ترجمہ کر رکھا ہے۔ ترقی پسندوں نے اگر ہماری تربیت نہ کی ہوتی تو شاید ہی اس طرف ہماری نگاہ جاتی۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ہی پہلی بار اردو ادب نے عالمی سطح پر اٹھ رہے سوالات کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ اس کے پہلے تک اردو اور اہلِ اردو اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ آج دنیا کے اہم اور غیر اہم، سماجی، سیاسی اور مختلف طرح کے سوالات پر شعر و ادب اور دوسرے منچوں پر اردو کے لکھنے والے اپنی دانشورانہ رائے پیش کرتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان میں جب نیوکلیر ٹسٹ ہوتے ہیں تب انتظار حسین کی کہانی، انور سجاد کا مضمون اور درجنوں ادیبوں کے ردِ عمل کے ساتھ ماضی میں دوسری جنگ عظیم اور 1942 کی تحریک کے تعلق سے ترقی پسند ادیبوں کا ردِ عمل یاد رکھنا چاہیے۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب کا دروازہ کشادہ کیا، ادیبوں کی سماجی اہمیت اور ان کی رائے کے اعتبار کو بڑھایا، ایک

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be create Abdiel Solutions Empowering Technologies

چھوٹے جغرافیائی خطے یا بند کمرے سے نکال کر اردو لکھنے والوں کو عالمی شہری بنایا۔ اپنے زمانے کے مسائل پر بے باکی اور ضرورت پڑنے پر برہمی کے ساتھ بھی رائے دینے کا سلیقہ عطا کیا۔ ادب یا ادیب کوئی حاشیے کی چیز نہیں ہیں۔ سماج میں ان کی اہمیت افکار و نظریات کے بنانے والوں کی ہے۔ اس لیے ان کے تئیں اہلِ اقتدار کا رویہ بھی مناسب ہونا چاہیے۔ ادب اور شاعری معروضی بنیادوں پر فروغ پاتے ہیں، انھیں تنگ نظری سے کوئی علاقہ نہیں۔ ترقی پسند تحریک نے جو یہ سارے سوالات اپنے زمانے میں قائم کیے، وہ آج بھی اردو کی رگ و پے میں موجود ہیں۔ کہنا چاہیے کہ اردو نے ان امور کو اپنی روح کا حصہ بنالیا۔ اس لیے ترقی پسند تحریک کے گونا گوں اثرات اور احسانات سے انکار کرنا حقائق سے چشم پوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اردو کا موجودہ ادب بھی ترقی پسندوں کے بعض بنیادی راستوں پر چل رہا ہے اور آیندہ بھی ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ اردو اس راستے سے الگ ہوگی۔

مختصر سوالات

۱۔ ترقی پسند ادبی تحریک کن بنیادوں پر قائم ہوئی؟

۲۔ موجودہ اردو ادب شہری تہذیب و تمدن کا عکاس بنا ہوا ہے۔ کیسے؟

۳۔ آزادی کے بعد اردو لکھنے والوں میں کیا فرق آیا؟

۴۔ ترقی پسندوں نے غزل گوئی کی طرف عدم توجہی کا رخ کیوں اپنایا؟

۵۔ درج ذیل ترقی پسند شعرا کی دو دو نظموں کے عنوان لکھیں :
فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز، ساحر لدھیانوی۔

۶۔ ترقی پسند ناولوں کے موضوعات اور دائرۂ کار کا تعین کن مصنفین کے قلم سے ممکن ہوا۔ ایسی چند تحریروں کے نام بھی درج کریں۔

۷۔ اردو افسانے کی سب سے طاقت ور نسل میں کن کا شمار ہوتا ہے؟ ان کے ایک ایک افسانوی مجموعے کا بھی نام لکھیں۔

۸۔ درج ذیل کتابوں کے مصنفین کے نام لکھیں : احتشام حسین، اختر انصاری، مجنوں گورکھ پوری، علی سردار جعفری، محمد حسن۔

تفصیلی سوالات

۱۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات واضح کیجیے۔

۲۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے کارناموں کو بیان کیجیے۔

۳۔ ترقی پسند تحریک میں عورتوں کی طاقت ور شراکت کی مثالیں پیش کیجیے۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

۴۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے کس روایت کی بنیاد رکھی جس کے بعد کی نسلیں اپنے لیے رہنما تصور کر سکے؟

۵۔ ترقی پسند غزل گوئی کا محاسبہ کیجیے۔

۶۔ ترقی پسندی کے دور میں صنفِ نظم کے ارتقا کے اسباب کیا ہیں؟ اس دور میں ہیئت اور موضوع کی سطح پر کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

۷۔ عظیم ترقی پسند ناولوں پر اپنے تاثرات قلم بند کیجیے۔

۸۔ ''ترقی پسند افسانے کی موضوعاتی دنیا پریم چند سے الگ ہے۔'' اپنی رائے مدلل پیش کریں۔

۹۔ ''فنِ تنقید اور ترقی پسند تحریک''۔ اس عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کریں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

غزل گوئی

غزل کو بعض نقادوں نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اردو شاعری کے سرمائے کا تجزیہ کریں تو اس صنف کی مرکزیت تسلیم کرنے میں کوئی کلام نہیں۔ انیسویں صدی تک اردو شاعری کا کم از کم پچانوے فی صد حصہ غزل کے حوالے رہا۔ بیسویں صدی میں نثر اور شاعری کی مختلف صنفوں کے باوجود غزل کا سرمایہ نصف سے کم معلوم نہیں ہوگا۔ ہر دور میں غزل گو شعرا اپنے عہد میں امتیاز حاصل کرتے رہے اور شاید ہی کبھی ایسی صورت پیدا ہوئی ہو کہ اپنے زمانے کا سب سے اہم شاعر غزل گو نہ ہو۔ ہماری مجلسی زندگی پر غزل کے اشعار اس طرح سے حاوی رہے ہیں کہ اکثر و بیش تر غزل کے سرمائے کو ہی پوری اردو شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو اگر کسی تہذیب کا نام ہے تو غزل واقعتاً اس کی روح ہے۔ اردو کے دو عظیم شعرا ـــــ میر اور غالب بھی غزل کے شاعر ہوئے۔ غزل کی اہمیت کے تعلق سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دکن کے ابتدائی شعرا سے لے کر آج تک تمام قابلِ ذکر شعرا نے اس صنف کو اپنی تخلیقی صلاحیت اور تکنیکی ہنرمندی کا میدانِ اوّل تسلیم کیا۔ میر اجی جیسے نظم نگار کے کلیات میں سو سے زیادہ غزلوں کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ غزل کا کوئی جادو ہے جو اردو شاعری کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

صنفی اعتبار سے غزل کا دائرہ کچھ خاص حدود سے مکمّل ہوتا ہے۔ یہ صنف قصیدے کی تشبیب سے علاحدہ کی گئی اور اس کا آزادانہ نام غزل ہے۔ جیسے تشبیب میں کسی موضوع کی قید نہیں تھی، وہ آزادی غزل گو شاعر کے نصیب میں بھی ہے۔ ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا لازم ہے۔ قصیدے کی روایت کی اِن دو مرحلوں میں تابع داری کے بعد غزل کا شاعر قصیدے سے اس اعتبار سے الگ ہو جاتا ہے کہ اسے ہر شعر میں ایک نئے مضمون کی داغ بیل رکھنی ہے۔ عہدِ قدیم میں یہ لازم کر دیا گیا کہ ایک شعر سے دوسرے شعر میں کسی قیمت پر کوئی معنوی ربط نہیں ہو۔ اب اگر کسی دو شعر میں معنوی تعلّق پیدا ہو گیا تو شاعر کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ "ق" لکھ کر اشعار کے قطع بند ہونے کا اعلان کرے غزل کی تعریف میں ایک اور بات تقریباً لازم مانی گئی کہ چاہے جو صورت بنے لیکن غزل کا شاعر عاشقانہ گفتگو ضرور کرے گا۔ جس کے سبب عشق و عاشقی کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ غزل ہو گئی۔ یہ سلسلہ حالات اور تصوّر کے بدلنے کے باوجود اب تک قائم ہے۔ اسی لیے غزل کا اصطلاحی معنیٰ عورتوں سے باتیں کرنا یا کلام میں عورتوں سے متعلق موضوع کو شامل مانا گیا۔

ہیئت کے اعتبار سے غزل مشکل صنف نہیں۔ اگر آپ کے پاس پانچ سات قوافی ہیں تو موزونیِ طبع کے سہارے ایک غزل تیار ہو سکتی ہے۔ مطلع میں دو قافیے اور پھر ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک ایک قافیہ استعمال میں آئے گا۔ ہر شعر

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

میں موضوعات بدل جاتے ہیں، اس لیے مختلف قوافی میں معنوی التزام کی کوئی قید بھی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اکثر نوآموز شعرا اپنا سفر غزل گوئی سے شروع کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے یہ مطلب برآمد نہیں کیا جانا چاہیے کہ غزل بے حد سادہ اور آسان صنف ہے۔ اس نے صرف نوآموزوں کو متوجہ نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے بہترین اور قادر الکلام شعرا کو بھی اُسی طرح اپنے حصار میں لیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اب یہ عام خیال ہے کہ غزل میں مبتدی اور بزرگ دونوں طرح کے شعرا کے لیے کشش کے اسباب موجود ہیں۔ مختلف شعرا کی مثالوں سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تخلیقی جلال کے عروج پر شاعر کو پھر سے غزل کی یاد آجاتی ہے۔ مشق کی پختگی اور مطالعۂ کائنات کی ہمہ گیری اور گہرائی کے ساتھ ہی صنفِ غزل سے شعرا کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ سعدیؔ، حافظ اور امیر خسروؔ کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کی مثال سامنے رکھی جائے تو یہ یقین ہوجائے گا کہ شعرا اپنے فن کے عروج پر کس طرح غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔

دکنی عہد میں مثنویوں کا سرمایہ ہر لحاظ سے وقیع ہے لیکن اردو شاعری کا یہ ابتدائی زمانہ غزلوں سے خالی نہیں۔ قلی قطب شاہ، ملا وجہی، نصرتی، میر بلاقی، فیروز جیسے شعرا کے دواوین میں اچھی خاصی تعداد میں غزلیں موجود ہیں۔ سترھویں صدی کے اواخر سے قبل تک دکنی غزلوں کا سرمایہ اپنی مخصوص افتادِ طبع، نئے لسانی تجربے اور موضوعات کی سطح پر ایک اشتراک کے سبب اپنی شناخت رکھتا ہے۔ لیکن دکنی غزل کو وہ شناخت نامہ جسے تاریخ کا اعتبار حاصل ہوا، اس کے لیے اردو ادب کو سترھویں صدی کے آخری دور تک منتظر رہنا پڑا۔ ولیؔ اور بعد میں سراجؔ اورنگ آبادی ارضِ دکن سے ابھرنے والے ایسے شعرا ہیں جن کی غزل گوئی نہ صرف دکنی شاعری کے لیے تاج کا درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ ایسے شعرا ہیں جنھیں دہلی کی اردو شاعری کو نئے سرے سے بنانے سنوارنے اور راستہ دکھانے کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ دکن کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں ولیؔ اور سراجؔ غزل کے بڑے شاعروں کی صف میں اس وجہ سے شامل ہوسکے کیوں کہ انھوں نے غزل کی اُس مخصوص روایت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جس کے سبب غزل فارسی میں طرۂ امتیاز حاصل کرسکی۔ مثنوی اور غزل کی فضا میں واضح فرق ہے، اسے ولیؔ سے قبل کے دکنی شاعروں نے صحیح طریقے سے سمجھنے میں کامیابی نہیں پائی۔ ولیؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ غزل کی آزمائی ہوئی دنیا کو انھوں نے دکن کے مخصوص مزاج کے ساتھ شیر و شکر کر کے ایک ایسا کامیاب تجربہ کیا جس کی وجہ سے انھیں اردو کا پہلا بڑا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں فارسی کے مسلّم الثبوت شعرا کی ایک بھیڑ دہلی میں موجود تھی۔ اس کے باوجود ولیؔ کی شاعری میں کون سا ایسا جادو تھا جس نے انھیں دہلی کے شعرا کو اپنی غزلوں پر غزلیں کہنے کے لیے دوسرے لفظوں میں اپنا تابع دار بن جانے کے لیے مجبور کیا۔ یہی سلسلہ سراجؔ اورنگ آبادی نے بھی اپنے انوکھے شاعرانہ رنگ سے آگے بڑھایا۔ دکنی شاعری کی تاریخ میں غزل کے تعلق سے ولیؔ اور سراجؔ دو ایسے چمکتے ہوئے ستارے ہیں جنھوں نے خود بہترین شعری سرمایہ یادگار چھوڑا اور شمالی ہندستان کے شعرا کی کامیاب رہنمائی کی۔

اٹھارویں صدی سے قبل دہلی میں اردو شعر و شاعری کا کیسا ماحول تھا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اسی زمانے میں جب مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو نے اس زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، یقیناً اس وقت اردو کا ایسا ماحول ہوگا جس کی وجہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہلی میں اردو پیدا ہوئی۔ لیکن اس کے بعد کئی سو برسوں تک دہلی کے ادبی ماحول پر اردو کا کوئی اثر نہیں رہا۔ دہلی کے ماحول پر فارسی کی حاکمیت حاوی رہی۔ شعرا کو فارسی میں ہی طبع آزمائی کرنے سے فائدہ تھا۔ اردو تقریباً نامانوس زبان کی طرح اس درمیان دکھائی دیتی ہے۔ کم از کم شاعروں، ادیبوں اور علما کی حد تک یہ بات صد فی صد صحیح ہے۔ ایک اور لسانی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ علما کی زبان اور عوامی زبان میں شدید تفاوت ہے۔ اسی لسانی ماحول میں جب ولی کا کلام دہلی پہنچا تو کلامِ ولی کی شاعرانہ صفات نے ایک نیا ادبی منظر نامہ پیدا کیا۔ شاعری کی یہ نئی دنیا تھی۔ دہلی کے فارسی گو شعرا مختلف روایات سے وابستہ تھے۔ مقامی موضوعات کے مقابلے انھیں ایران و عرب کے تلازمے پسند تھے۔ اس وجہ سے بھی دہلی کی فارسی شاعری مقامی باشندوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہی۔ ولی کی غزلوں نے دہلی کی اردو شاعری کو راستہ دکھایا۔ سامنے کے لفظ، قرب و جوار کی زندگی اور رسوم و رواج کو شاعری کا حصہ بنانا، اخلاق اور تصوّف کے ساتھ ساتھ احساس اور جذبوں کی سچائی شعرائے دہلی کے لیے ایسے رہنما اصول تھے جن کی بنیاد پر دہلی کی نئی شاعری قائم ہوئی۔

ولی اور پھر سراج اورنگ آبادی نے اہلِ دہلی کے لیے جو نشانِ راہ طے کیے، اگلے پچاس برسوں میں تین نسلیں دہلی میں شعرا کی سامنے آئیں —— ایہام گو، اصلاحِ زبان کے موید ین اور میر و سودا کے ہم عصر۔ ادب کی تاریخ لکھنے والے واقف ہیں کہ ان تینوں نسلوں پر ولی کے براہ راست اثرات پڑے۔ ایہام گو شعرا میں آبرو، فائز، شاکر ناجی جیسے اہم شعرا کی نگرانی میں شمالی ہندستان میں غزل گویوں کی ایک پوری جماعت قائم ہوگئی۔ ولی سے ان شعرا نے ہندوی اظہار کو تو سیکھا لیکن نفسِ مضمون کی گہرائی سے دور رہے۔ تجربہ پسندی بہت تھی لیکن ہدف صحیح نہیں ہونے کی وجہ سے اس عہد میں شاعری کبھی لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتی ہے تو کبھی لذت کوشی کا منبع۔ انھیں وجوہات سے اصلاحِ زبان کے مجاہدین نے اردو شاعری کے دامن کو ایہام گویوں کی غلط کاریوں سے پاک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے بجا طور پر ردِ عمل کی تحریک کہتے ہیں۔ مظہر جانِ جاناں کی قیادت میں شاہ حاتم، انعام اللہ خاں یقین کے ساتھ مل کر اصلاحِ زبان کی تحریک چلاتے ہیں جس کا ایک بڑا سبب فارسی اور دکنی روایت کی آپسی مخاصمت ہے۔ تحریک کاروں کے ذریعہ متروکات کی جو فہرست تیار کی گئی، اس میں دکن میں آزمائے لفظوں کا حصہ ننانوے فی صدی تھا۔ یہ دہلی کے فارسی گو اساتذۂ فن کے مقابلے میں دکن کے ولی کے اثرات کو محدود کرنے کا ایک لائحۂ عمل بھی تھا۔ بڑی حد تک اصلاحِ زبان کے شعرا اس مہم میں کامیاب بھی ہوئے۔ شاہ حاتم نے اپنی کبر سنی کے باوجود نیا دیوان تیار کیا اور مثال قائم کی کہ پرانی شاعری اور اصلاحِ زبان کے بعد کی شاعری میں واضح فرق ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ایہام گویوں میں آبرو اور اصلاحِ زبان کے شعرا میں حاتم اور انعام اللہ خاں یقین ایسے افراد ہیں جنھیں اہمیت دی جاسکتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس پائے کا شاعر نہیں جسے اہم غزل گو کی حیثیت دی جاسکے۔ اصل میں اردو کے عہد زرّیں کے لیے ان دونوں مخالف تحریکوں نے تجربے کی وہ بنیادی زمین تیار کی جس کی بدولت میر، سودا اور درد جیسے شعرا دہلی کے آسمان پر ابھرے۔

اصلاحِ زبان کی تحریک کے بعد دہلی میں اردو شاعری کا جو منظر نامہ تیار ہوا، وہ تین عظیم شاعروں کی کوششوں سے ممکن ہو سکا۔ 1730 سے 1750 کے دوران سودا، درد اور محمد تقی میر نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوانا شروع کر دیا۔ یہی وہ شعرا ہیں

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

جن کی بدولت اردو شاعری کی تاریخ میں اس مخصوص زمانے کو "عہدِ زرّیں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دہلی کے یہ تین شاعر نہیں بلکہ اردو غزل کے تین مکاتب فکر اور علاحدہ علاحدہ تین اسالیب غزل ہیں۔ سوداؔ کے یہاں غزل کا مردانہ آہنگ پہلی بار اظہار کا مکمل سلیقہ پاتا ہے۔ قصیدے سے الگ سوداؔ کی غزل گوئی اردو شاعری کا وہ مخصوص لہجہ ہے جس سے استفادہ کر کے غالبؔ اور آتشؔ نے اپنی شاعری کی زمین تیار کی۔ دردؔ اردو غزل میں صاحبِ تصوّف شعرا کے سرخیل ہیں۔ وہ نہ صرف ایک صاحبِ طریقت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کی شاعری میں تصوّف اور معرفت جیسے دقیق موضوعات پر سیکڑوں اشعار موجود ہیں۔ دردؔ نے "منتخب" مضامین پیش کرنے کا ہنر بھی اردو غزل گویوں کو عطا کیا لیکن سوداؔ اور دردؔ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عہد کو اردو غزل کی تاریخ میرؔ کی وجہ سے جانتی ہے۔ میرؔ کی عمر طویل رہی اور وقت نے بھی انھیں تجربوں کا بڑا سرمایہ عطا کیا۔ تاریخ کا وہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں سماجی اور سیاسی قدریں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ میرؔ نے ان سب کو جوڑ کر ایک ایسی شاعری بنائی جسے آج دل اور دلّی کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ میرؔ نے شاعری سے وہ کام لیا جس کے لیے عام طور پر تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے وقوعے تصرّف میں لائے جاتے ہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اردو غزل کے قارئین میرؔ کی معنویت قائم پاتے ہیں تو اس کے پیچھے انھیں اسباب کا دخل ہے۔

عہدِ زرّیں میں کئی اور شعرا ہیں جنھوں نے دہلی کو اپنی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ مصحفیؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، جعفر علی حسرتؔ اور اشرف علی فغاںؔ جیسے شاعروں نے شمالی ہندستان کی اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ مصحفیؔ کو اردو کا سب سے بڑا قادر الکلام شاعر کہا جاتا ہے۔ جس طرح وہ دہلی میں ممتاز ہیں، اسی طرح لکھنؤ میں ایک دو نہیں کل آٹھ دواوین یادگار چھوڑے۔ شاگردوں کی پوری ایک فوج کھڑی ہو گئی۔ زبان کی صفائی اور محاورات کا استعمال اردو میں مصحفیؔ سے لوگوں نے سیکھا۔ نظیرؔ اکبرآبادی یوں تو صنفِ نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن سوداؔ کی طرح ہی وہ بھی اچھا خاصا غزلیہ سرمایہ پیش کر چکے تھے۔ زبان کا عمومی سطح پر آ کر استعمال اور تجربوں کی وسعت اُن کی شاعری بالخصوص غزل کا امتیاز ہے۔ حسرتؔ اور فغاںؔ کو دہلی کے مہاجر شعرا کا اوّلین نمائندہ مانا جاتا ہے جنھوں نے لکھنؤ پہنچ کر شاعری کا ایک نیا سلسلہ اور جہانِ معنیٰ تیار کیا۔ لکھنؤ اسکول کے ابھرنے سے پہلے دہلی غزلیہ شاعری کے معاملے میں سب سے اونچے مقام پر موجود تھی۔ میرؔ کو اگر "ناخدائے سخن" کہا جاتا ہے اور غالبؔ نے بھی انھیں استاد اور خود کو ان کا پیروکار مانا تو یہ اردو شاعری میں میرؔ کا وہ امتیاز ہے جس کے مقابل کوئی دوسری شخصیت کبھی ابھر نہیں سکی۔

دہلی کے مہاجر شعرا اور اودھ کے خطّے میں شعرائے اردو کی پہلی نسل نے مل کر اردو غزل کا ایک نیا انداز وضع کیا۔ یہ صحیح ہے کہ جو شعرا دہلی سے اودھ تشریف فرما ہوئے، اُن کی شاعری میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہو جائے گی، اس کا زیادہ امکان نہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے سیاسی اور سماجی ماحول میں کوئی ایسا امتیاز شاید ہی دیکھنے کو ملے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ دونوں مقامات کی شاعری میں آسمان زمین کا فرق ہونا چاہیے۔ شعرائے لکھنؤ اور مہاجر شعرا نے مل کر ایک مختلف رنگِ سخن قائم کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر میرؔ، سوداؔ اور دردؔ نے اردو غزل کا جو سلسلہ قائم کیا تھا، اس سے گریز کی صورت پیدا ہوئی۔ انشاؔ اللہ خاں انشاؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ، امام بخش ناسخؔ، قلندر بخش جرأتؔ نے واقعتاً ارضِ لکھنؤ میں اردو غزل کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ اردو تنقید نے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

جس شاعری کے نفسِ مضمون کے بارے میں ''چوما چاٹی'' کہا تھا، وہ اصل میں انھیں شعرا پر نافذ ہوتا ہے۔ استادانہ رکھ رکھاو کے نام پر ''شمس'' شاعری کا کاروبار عام ہوگیا۔ محاورہ بندی، معاملہ بندی، رعایتِ لفظی کا اس زمانے کی غزل میں دور دورہ رہا۔

میر حسن نے پانچ سو سے زیادہ غزلیں کہیں لیکن اُن کی شناخت مثنوی نگار کے طور پر ہوئی۔ میر حسن کی غزلوں میں مثنوی جیسی روانی اور محاکات و جذبات نگاری یا تہذیب و ثقافت کی جلوہ گری بھلے موجود نہ ہو لیکن زبان اور جذبوں کی شفافی انھیں قابلِ ذکر غزل گو بناتی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں خواجہ حیدر علی آتش ایسے تنہا غزل گو ہیں جن کے سرمایۂ سخن پر اودھ کو ناز کرنا چاہیے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ آتش ایسے واحد لکھنوی شاعر ہیں جنھوں نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے بیچ نقطۂ مفاہمت ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی۔ لہجے کی سطح پر آتش نے سودا کے رنگِ سخن کی طرف دھیان کیا اور مضمون کے لیے خواجہ میر درد کو نشانِ راہ بنایا۔ زبان کے سارے لکھنوی کرتب بھی ان کے پیشِ نظر رہے۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ لکھنؤ میں اردو غزل کی ایک قد آور شخصیت سامنے آئی۔ جس طرح مثنوی میں میر حسن، مرثیہ میں انیس اور دبیر نے اپنی صلاحیتوں سے ایسا ادبی منظر نامہ قائم کیا جسے ایک ہی وقت میں لکھنؤ اور دہلی دونوں میں قبولیت ملنے لگی، اُسی طرح خاکِ لکھنؤ سے ابھرے غزل گویوں میں صرف خواجہ آتش کی یہ حیثیت ہے کہ انھیں ہر دبستان کے لوگ یکساں امتیاز عطا کریں۔

اٹھارھویں صدی میں دہلی کے شعرا کے لیے مشکلات بہت تھیں لیکن شعر و ادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے پہلے اربع میں پھر غالب، مومن اور ذوق کی شکل میں شعرا کا ایک ایسا قافلہ سامنے آیا جس نے اردو غزل کے سرمائے میں اپنی صلاحیتوں سے واضح اضافے کیے۔ یہ دوسرا موقع ہے جب دہلی میں ''عہدِ زرّیں'' کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ غالب نے مضمون آفرینی، جدت طرازی، بلند خیالی اور فلسفہ پیمائی کی بنیاد پر ایک ایسا شاعرانہ طلسم قائم کیا جس کی معنیاتی دنیا اب بھی صاحبانِ ذوق کے لیے حیرت زائی کا باعث ہے۔ اپنے دیوان کے اختصار سے غالب نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ شاعری کے دفتر سجا دینے سے بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا جاتا بلکہ منتخب جذبوں کی پُر اثر ترجمانی شاعر کا فریضہ ہے۔

حکیم مومن خاں مومن، غالب جیسے جلیل القدر ہم عصر کے باوجود اردو غزل میں اپنا ذاتی اسلوب قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سادہ سے الفاظ اور عشق و عاشقی کے معصومانہ جذبات، انسانی زندگی کی سچی ترجمانی، مومن کا وصفِ خاص ہے۔ غزل کو میر نے اپنے عہد کے حقائق کا ترجمان بنایا اور غالب نے افکار کی بلندیاں عطا کیں۔ اس مرحلے میں نازک اور لطیف جذبوں کی ترجمانی بڑے غزل گویوں کے لیے دور کی کہانی ہوگئی تھی۔ حالاں کہ غزل کی تاریخ عاشقانہ جذبوں کے بے ریا اظہار سے بھری پڑی ہے۔ مومن کا یہ شاعرانہ کمال ہے کہ انھوں نے غزل کو اس کی نازک خیالی کے ساتھ پھر سے زندہ کیا۔

ذوق قصیدہ گوئی اور استادانہ رکھ رکھاو کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ مشکل قوافی اور ردیف میں غزلیں کہہ کر انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ''استادِ شہہ'' کی قادر الکلامی کیسی ہوتی ہے۔ ذوق نے سادہ لفظوں میں بھی بعض غزلیں کہیں۔ قصیدہ گو کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت انھیں غزل کا تاج نہیں پہنا سکی۔ ذوق کے شاگردوں میں داغ دہلوی ایک نئے انداز کو قائم کرنے میں مشہور ہوئے۔ لکھنؤ میں ''زبان کی شاعری'' کا بڑا چرچا تھا۔ داغ نے دہلوی معاشرے میں اسے بہ کمال آزمایا۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

محاوروں سے کھیلنا اور دہلی کی زبان کا شعری نگار خانہ تیار کرنا، دورِ آخر کے شاعروں میں صرف داغ کے حصے میں آیا۔ داغ نے مومن کی طرح سلجھی ہوئی عاشقانہ شاعری کو برتنے کے بجائے جرأت اور رنگین کی طرح غیر تہذیبی زمروں میں سیر کرنے کی کوشش کی۔ یہی داغ کی شاعری کی حد ہے۔ آج داغ کی تاریخی اہمیت زبان کے شاعر کی حیثیت سے ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں داغ کے علاوہ جن غزل گو شعرا نے اپنی شناخت قائم کی، اُن میں حالی اور اکبر اہم ہیں۔ ہر چند کہ حالی کی پرانی اور نئی غزلوں کی تقسیم ایک مشہور بات ہے اور خود حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں غزل گوئی کے تعلق سے اپنے ذہنی تعصبات ظاہر کیے ہیں لیکن حالی کی غزلیں بالخصوص پرانی غزلیں اردو غزل کا ایک علاحدہ رنگ ہیں۔ جذبوں کی حقیقی ترجمانی اور زبان کا سلجھا ہوا انداز حالی کا وہ معیار سخن ہے جس سے اُن کی شناخت قائم ہوئی۔ رشید حسن خاں نے حالی کے مقدمے سے پہلے والی شاعری یعنی پرانی شاعری کی تعریف کی ہے اور 1893 کے بعد کی غزلوں کو ''بے رس'' کہا ہے۔ حالی دورِ اوّل میں بہترین غزل گو، دورِ دوم میں ممتاز نظم نگار اور دورِ سوم میں ناقد اور سوانح نگار ہیں۔ حالی کے ہم عصروں میں اکبر الہ آبادی یوں تو اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے اہم ہیں لیکن اُن کے دیوان میں شامل غزلوں کے مطالعے سے اُن کی غزل گوئی قابلِ توجہ ہو جاتی ہے۔ حالی اور اکبر دونوں اردو میں قومی ضرورتوں کے اعتبار سے شعر گوئی کرنے والے ایسے فن کار ہیں جنھیں سیاسی اور سماجی احوال کے پیشِ نظر غزل کو بدلنے کی ذمے داری ملی تھی۔ اس کام میں دونوں شعرا بے حد کامیاب رہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس روایت کا مینارۂ نور اقبال نہیں بن سکتے تھے۔

اقبال، شاد اور حسرت کو جدید غزل کا معمار کہا جاتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے شاد کو اوّلیت حاصل ہے۔ دبستانی تفوق کے ماحول میں شاد عظیم آبادی نے لکھنؤ اور دلّی کی صالح قدروں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ فارسیت کے ساتھ ہندی اسلوب کو بھی اُن کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اب تک کسی استاد شاعر نے ''فارسی شاعری کا نمک'' اور ''ہندی شاعری کا درد'' یکجا کرنے میں کامیابی نہیں پائی تھی۔ یہ شاد کا بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال دورِ اوّل سے ہی لکھنؤ اور دلّی سے الحاق کے خلاف تھے۔ اقبال کے غزلیہ سرمائے کے مقابلے نظمیں زیادہ ہیں لیکن جب بالِ جبریل کی غزلوں اور اقبال کی بعض مشہور نظموں کے غزلیہ انداز کا جائزہ لیا جاتا ہے تو انھیں نہ صرف اپنے عہد میں ایک نئی غزل بنانے والے شاعر کے طور پر پہچانا جاتا ہے بلکہ اردو کے عظیم شعرا کی صف میں بھی انھیں میر و غالب کے بعد جگہ دی جاتی ہے۔ اقبال اردو کے ایسے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم اور غزل کے بیچ کی دوری کو کم کیا۔ شمیم حنفی نے تو تجزیہ کر کے یہ بتا دیا ہے کہ اقبال کی غزل میں نظم اور نظم میں غزل گھل مل گئی ہے۔ غالب نے غزل کو فکری اڑان عطا کی تھی لیکن اقبال نے اسے باضابطہ فکر و فلسفہ کا ترجمان بنایا۔ قومی ضرورتوں کا پاس اقبال کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔

حسرت نے اردو کی عاشقانہ غزل کو نئے عہد کے اعتبار سے بدلنے میں کامیابی پائی۔ حسرت کی شاعری میں محبوبہ ہم مشرب ہے۔ اظہارِ عشق کے لیے بھی حسرت نے عورت کو موقع دیا۔ محبوبہ گھریلو عورت یا بیوی ہو سکتی ہے، غزل میں یہ تصور حسرت کے تعلق سے اجاگر ہوا۔ بعد کی غزل پر شاد، اقبال اور حسرت تینوں کے گہرے اثرات ہیں۔

اقبال کی زندگی میں ہی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں غزل کو جاگیردارانہ عہد کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

علم بردار مان کر احتراز برتنے کی کوشش ہوئی۔ یہ بات مشہور ہوئی کہ "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل"۔ جوشؔ سے لے کر جگرؔ مرادآبادی تک شعرا اپنی غزلوں پر عنوان ڈال کر رسائل اور مجموعوں میں منظومات کے بطور شائع کراتے رہے۔ تاریخی اعتبار سے غزل کے لیے یہ مشکل دور تھا۔ ترقی پسندی کے ابتدائی زمانے میں تحریک سے الگ تھلگ رہنے والے دو شاعروں نے غزل گو کی حیثیت سے اپنی جگہ قائم کی۔ فراقؔ اور یگانہ چنگیزیؔ اس عہد میں اردو غزل کے دو مستند اسالیب کے روح رواں مانے گئے۔ اقبالؔ کے بعد اردو غزل کا ایک سلسلہ ترقی پسندوں سے ملتا ہے، بقیہ دو دھارے فراقؔ اور یگانہ سے۔ فراقؔ نے ابتدا میرؔ کے لہجے کو اپنے شعور کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ ترقی پسندوں کے انقلابی تصور کے سامنے فراقؔ نے شاعری کی ہند ایرانی عاشقانہ روایتوں کو اپنی ذات میں مدغم کرنے کا کام کیا۔ فراقؔ اسی وجہ سے غزلیہ شاعری کے ایک نئے اسلوب کو وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اقبالؔ کے بعد بلاشبہ فراقؔ غزل گو کی حیثیت سے سب سے توانا اور مستحکم آواز ہیں۔

یگانہؔ کی غالب شکنی زیادہ مشہور ہوئی اور شخصیت کے تشدد آمیز رویے نے اُن کی شاعری کو نقصان پہنچایا۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور آتشؔ جیسے شعرا کے اسالیب کے امتزاج سے اگر کوئی علاحدہ اسلوب غزل پیدا ہو سکتا ہے تو وہ یگانہؔ کی شکل میں ہوگا۔ یگانہؔ کی یہ اضافی بدنصیبی ہے کہ انھیں صرف لفظوں کے توڑ پھوڑ کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ یگانہؔ میں سوز اور دردمندی بھی ہے۔ رقت آمیزی اُن کی شاعرانہ شخصیت کا جزو خاص ہے۔ ان سب پر مستزاد مردانہ آہنگ، محاورات کا بڑے پیمانے پر استعمال اور کسی بھی لفظ سے معنی نکال لینے کا ہنر یگانہؔ کا شناخت نامہ ہے۔ سادہ لفظوں پر انحصار کر کے غزل بنانا بیسویں صدی میں صرف یگانہؔ کو آیا۔ ایک ہی ساتھ کلاسیکیت اور باغی لہجہ، یگانہؔ کے علاوہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ شادؔ عارفی، مظفرؔ حنفی، صدیقؔ مجیبی، شجاعؔ خاور، متورؔ رانا اور خورشیدؔ اکبر جیسے شعرا ابھرے جن پر یگانہؔ کی شخصیت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔

ترقی پسندوں کے حلقے میں عام طور پر غزل گو شعرا کے لیے اچھے خیالات نہیں پیش کیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود مجروحؔ سلطان پوری اور غلام ربانی تاباںؔ نے غزل گوئی کو ہی اظہار کا آئینہ بنایا۔ مجروحؔ کی غزلیں مخصوص ترقی پسندانہ مفاہیم کی وجہ سے بھی زیادہ مشہور ہوئیں۔ مجروحؔ نے تو نظموں سے بھرپور بے اعتنائی برتی۔ مجروحؔ کا سرمایۂ سخن زیادہ نہیں لیکن ترقی پسندانہ شعور کو غزل کے ذریعہ عام کرنے میں ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ مجروحؔ نے بعض روایتی اصطلاحوں کو ایسے ترقی پسندانہ مفاہیم عطا کیے جو آج مقبول خاص و عام ہیں۔ فیضؔ نے ابتدا کم غزلیں کہیں لیکن دھیرے دھیرے اگلے مجموعوں میں غزلوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ فیضؔ کی شخصیت میں جو فکری اور جذباتی توازن تھا، اسی نے انھیں ایسا ترقی پسند شاعر بنایا جسے ہر حلقے میں قبولیت ملی۔ فیضؔ نے روایت سے روشنی لی اور اپنے عہد کی جھانکی سے اُسے جوڑا۔ معینؔ احسن جذبی کے مختصر سرمایۂ سخن میں غزلیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مخدومؔ محی الدین نے محض اکیس غزلیں لکھیں لیکن ترقی پسندوں کے درمیان غزل کے جو کامیاب شعرا ہیں، اُن میں مخدومؔ کا شمار ہوتا ہے۔

جمیلؔ مظہری، روشؔ صدیقی، سیمابؔ اکبرآبادی، جگرؔ مرادآبادی اور بزرگ شعرا میں فانیؔ اور اصغرؔ اصلاً روایتی دبستان کے غزل گو ہیں۔ فلسفہ طرازی، تصوف، انسانی دردمندی اور کبھی کبھی باغیانہ انداز ان تمام شعرا میں موجود ہے۔ اس کے باوجود

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

انھیں اپنے بعد کے لوگوں کو متاثر کرنے والا شاعر قرار دینا صحیح نہیں۔ اِن میں سے کئی ترقی پسندوں سے متعلق بھی ہوئے لیکن ترقی پسندی اِن کے مزاج کا حصّہ نہیں بن سکی۔ دوسرے ترقی پسند شعرا میں جن کی بعض غزلیں پہچانی جاتی ہیں، اُن میں ساحر لدھیانوی، پرویز شاہدی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقی پسند عہد میں غزل گو، نظم نگاروں کے مقابلے زیادہ نہیں ابھر سکے۔ اس کے باوجود ترقی پسند غزل اردو کی تاریخ کا ایک مکمّل باب ہے اور عہدِ اقبال اور جدیدیت کے درمیانی وقفے میں یہ شعرا اپنی شناخت قائم کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔

1947 کے بعد دھیرے دھیرے ترقی پسندانہ تصوّرات کی ادبی پہچان زائل ہونے لگی۔ ترقی پسندوں کا ایک حلقہ اشتراکیت کو کُل کائنات سمجھنے لگا۔ جس کی وجہ سے غزلیہ شاعری نعرے میں تبدیل ہونے لگی۔ ترقی پسندوں کی نئی نسل ان مسائل پر توجّہ دے رہی تھی۔ ترقی پسندوں سے باہر بھی اردو غزل کی بعض معتبر آوازیں موجود تھیں۔ اسی موقعے سے اتباعِ میر اور فراق کے لہجے کو اپنانے کے مرحلے میں اردو کے تین ایسے غزل گو سامنے آئے جنھیں جدیدیت کی غزل گوئی کا نمایندہ مانا جاتا ہے۔ ناصر کاظمی، ابنِ انشا اور خلیل الرحمان اعظمی نے ایک ایسی غزل ایجاد کی جس میں ذات کی محرومی، اکیلے پن اور شہری زندگی کے عذاب، موضوع بن رہے تھے۔ ان تینوں شاعروں نے ترقی پسندی سے گریز کا راستہ تو طے کیا لیکن اردو کی روایتی شاعری کے انداز سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ابنِ انشا کا بیراگی روپ، ناصر کاظمی کی گم شدگی، اپنے زمانے کے سچّے حالات کے مقابل خلیل الرحمان اعظمی کی طرح کھڑا ہونا اردو کی جدید غزل کو مقبول بنانے میں کامیاب حربے کے طور پر سامنے آئے۔ حسن نعیم، مظہر امام، باقر مہدی، شہزاد احمد جیسے شعرا جدید غزل کے ان ابتدائی بنیاد گزاروں میں ہیں جنھوں نے 1960 سے قبل نئی غزل کا خاکہ تیار کیا۔

1960 کے آس پاس اردو کی جو نئی غزل سامنے آئی، اس کے دو رنگ واضح تھے۔ سب سے مقبول لہجہ جس سے جدید شعرا پہچانے گئے، وہ اینٹی (Anti) غزل کا تھا۔ تجربہ پسندی کے انتہا مقام پر پہنچ کر شعرا نے غزل کے سارے روایتی گوشوں کو تیاگ کر ایک ایسی غزل تیار کرنے کی کوشش کی جس کا سلسلہ پیچھے سے نہیں ملتا تھا۔ عادل منصوری، محمد علوی، افتخار عارف، کمار پاشی، انیس ناگی نے جو غزلیں کہیں، اُن کے الفاظ، مضامین اور اسالیب نے غزل کی روایت سے پورے طور پر خود کو الگ کیا۔ شاید اسی لیے اِن غزل گو شعرا کا لطفِ بیان کے طور پر تو ذکر ہوتا رہا لیکن جدید غزل کو انھوں نے کوئی نیا رنگ دیا ہو، اسے ماننے والا شاید ہی کوئی ملے۔ اس زمانے میں جو بے سر و پا نظمیں کہی جا رہی تھیں، اُن کے بھی اثرات ان غزلوں پر رہے۔

اینٹی (Anti) غزل کے دور میں ہی سلجھے ہوئے انداز میں زندگی کے نئے حقائق کو پیش کرنے والے شعرا کم نہیں تھے۔ شکیب جلالی، باقی، زیب غوری، سلطان اختر، بشیر بدر، ندا فاضلی، شہریار، بشر نواز، حسن کمال، لطف الرحمن، علقمہ شبلی، قیصر شمیم جدیدیت کے عہد کے وہ نمائندہ غزل گو ہیں جن کی غزل گوئی نے 1960 کے بعد کی اردو شاعری کی نئی تصویر قائم کی۔ انھیں شعرا کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ نظم نگاری کے مقابلے پھر ایک بار غزل گو شعرا نے اپنی تخلیقی قوت سے اپنے عہد کا ادبی امتیاز پایا۔ جدیدیت کے سارے مشہور مضامین، تراکیب، پرانی غزل سے واضح نقطۂ انحراف، اس عہد کی غزل کا امتیازی نشان ہے۔ اینٹی (Anti) غزل سے جدیدیت کی غزل کو جو نا مقبولیت ملی تھی، اس کی بھرپائی نئے غزل گویوں سے بہ احسن ہو گئی۔ ان میں سے اکثر غزل گو اپنا علاحدہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

رنگِ سخن قائم کرنے میں مصروف ہیں۔

1970 کے بعد غزل گویوں کا ایک نیا حلقہ سامنے آیا جس کا ایک سلسلہ جدید شعرا سے متعلق تھا تو دوسرا بدلتی ہوئی زندگی سے مل رہا تھا۔ عرفان صدیقی، ظفر گورکھ پوری، اسعد بدایونی اور شجاع خاور جیسے شعرا کو نہ تو جدیدیت کے زمانے کا پروردہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے الگ تھلگ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان شعرا نے جدیدیت سے الگ ہونے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن ایک علاحدگی کا انداز یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا واضح رنگ 1980 کے بعد کے شعرا میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شہپر رسول، عبدالاحد ساز، خورشید اکبر، عالم خورشید، شہاب الدین ثاقب خالد عبادی، جمال اویسی، مہتاب حیدر نقوی، فرحت احساس جیسے شعرا واضح طور پر جدیدیت کی غزل سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان نسل کی لفظیات، موضوعات اور طرزِ حیات —— سب ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے الگ ہیں۔ سہولت کے لیے انھیں مابعد جدید غزل گو قرار دیا جاتا ہے۔ اردو غزل کے آسمان پر موجودہ زمانے میں جدید شعرا کی آخری نسل اور مابعدِ جدید شعرا کی پہلی اور دوسری نسل سرگرمِ سفر ہے۔

موجودہ عہد کے غزل گو شعرا کی تخلیقی سمت و رفتار پر غور کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں مختلف روایتوں کا واضح نشان موجود ہے۔ کلاسیکیت سے گریز، ترقی پسندی، جدیدیت جیسے مختلف اور متضاد عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ غزل گوئی میں یہ امتزاجی رنگ نہایت خوش آیند ہے۔ اقبال کے عہد کے بعد اردو غزل میں کچھ انفرادی لہجے ضرور ابھرے لیکن غزل کے تئیں ایک عمومی بہتری کا ماحول نہیں پیدا ہو سکا۔ ترقی پسندی میں نظم گوئی زیادہ اعتبار حاصل کر سکی اور جدیدیت کے زمانے میں بھی نظم نگار چھائے رہے۔ 1970 کے بعد اور خاص طور پر 1980 کے بعد غزل گویوں کا ایک مضبوط قافلہ میدان میں آیا۔ ان غزل گویوں کے متعلق آپ آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کلاسیکیت کو یہ نہیں سمجھتے۔ عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، شہپر رسول، عبدالاحد ساز اور خورشید اکبر کے یہاں بھرپور کلاسیکی شعور بھی ہے۔ ترقی پسندوں پر یہ الزام تھا کہ رنج کی باتیں اُن کے یہاں نہیں ہیں لیکن موجودہ عہد کے غزل گویوں میں اکثر شعرا کے یہاں دلی واردات و کیفیات اپنی گہرائی کے ساتھ موجود ہیں۔ تجربہ پسندی کا ہنر بھی اگر دیکھنا ہو تو شجاع خاور، منور رانا، خالد عبادی اور خورشید اکبر کی شاعری بطور مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد ایسا موقع غزل گو شاعروں کے ہاتھ آیا ہے جب غزل گوئی کے خلاف کوئی اعلان شدہ ممانعت نہیں ہے۔ مختلف تجربوں میں دو تین نسلوں نے یہ دیکھ لیا کہ غزل کا کامیاب سلسلہ امتزاج میں ہے۔ میر اور غالب نے جس طرح کائنات اور ذات کے تجربوں کو شیر و شکر کر کے غزل کے قالب میں ڈھالا تھا، وہی اب بھی غزل کے لیے بہترین ماڈل ہے۔ اس عہد کے شعرا اسی نہج پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غزل کی طویل تاریخ اچھے خاصے نشیب و فراز کے دور سے گزری۔ اکثر اس کی صنفی حیثیت پر اعتراضات ہوئے اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کے بارے میں شبہات روا رکھے گئے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور نظم جیسی صنفوں سے الگ الگ زمانے میں غزل کا مقابلہ رہا۔ حقیقت یہی ہے کہ غزل تمام مورچوں پر خود کو سربلند رکھنے میں کامیاب رہی۔ یہ سوال اہم ہے کہ ہر دور میں غزل کیوں کامیاب ہوتی گئی۔ ہر زمانے کے مستند غزل گو شعرا کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل گو شعرا اپنی شاعری کی بنیاد ''حقیقی جذبات'' اور ''روحِ عصر'' پر رکھتے ہیں۔ اردو کی کوئی کلاسیکی صنف ایسی نہیں جس کے لیے یہ دونوں باتیں کہی جا سکیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

ولی سے لے کر موجودہ عہد کے شعرا تک غزل کا ہر شاعر ظاہر اور باطن دونوں دنیا کی سیر کرتا ہے۔ کلاسیکی دور میں اسے غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے یاد کیا جاتا تھا۔ میر کے یہاں اسے 'دل اور دہلی کا مرثیہ' کہتے ہیں۔ غزل کی مقبولیت کو سمجھنے کے لیے غزل کی داخلی دنیا کی طرف توجہ ضروری ہے۔ عاشقانہ شاعری کے لیے سب سے بہتر حربہ غزل، صوفیانہ شاعری کے لیے آزمائی ہوئی صنف غزل، رندی و سرمستی کے لیے غزل، موسیقی کے لیے غزل، فاسقانہ جذبات کے لیے غزل، خدا ترسی کے لیے غزل ـــــ زندگی کی کون سی منزل ہے جہاں غزل گو ہمیں خالی ہاتھ بھیجتا ہے۔ غزل کی محدودیت جس کی طرف حالی اور کلیم الدین احمد متوجہ کرتے ہیں، وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن اردو شاعری میں کوئی دوسری ایسی صنف نہیں جس کے پاس اتنا وسیع نقطۂ نظر اور گہرا انسانی اور فنی شعور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غزل مختلف ادوار میں ضرورت کے اعتبار سے اپنی صورت کو بدلتے ہوئے نہ صرف ہمارے عہد میں قائم ہے بلکہ آیندہ بھی اس کی طاقت ور موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر گفتگو

۱۔ غزل کی صنفی خوبیاں بتائیے۔
۲۔ دکن کے پانچ غزل گو شعرا کے نام بتائیے۔
۳۔ ایہام گوئی سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ دو ایہام گو شاعروں کے نام لکھیے۔
۴۔ میر کی غزل گوئی سے اپنی واقفیت کو تحریر کیجیے۔
۵۔ سرزمینِ دہلی سے تعلق رکھنے والے دس غزل گویوں کے نام لکھیے۔
۶۔ دہلی سے اودھ ہجرت کرنے والے شعرا کی ایک فہرست بنائیں۔
۷۔ ''اینٹی غزل'' کے تصور سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''دہلی میں اردو شاعری : ایہام گوئی سے عہدِ زرّیں تک'' ـــــ اس موضوع پر ایک مختصر مضمون تحریر کیجیے۔
۲۔ لکھنؤ کی غزل گوئی کو موضوعِ بحث بنائیے۔
۳۔ حالی اور اکبر کی غزلوں کے محاسن کیا ہیں؟ مفصل بیان کیجیے۔
۴۔ اقبال کی غزل گوئی کے امتیازات واضح کیجیے۔
۵۔ ترقی پسندوں کی غزل گوئی کے سلسلے سے ایک تعارفی مضمون لکھیے۔
۶۔ ہر دور میں غزل کی مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟ اپنے تاثرات کو دلیلوں سے واضح کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

نظم نگاری

سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر مغرب کی تیز ہواؤں کا جو شور اٹھا، اُسی میں نظمِ جدید کی داغ بیل پڑی۔ مغرب میں نظم کے لیے یہ طریقہ اپنایا جاتا تھا کہ کسی خیال کو شروع سے آخر تک ترتیب سے بیان کیا جائے جو غزل سے بالکل مختلف ہے۔ ''انجمن پنجاب'' کے جلسوں میں محمد حسین آزاد اور حالی اپنی ابتدائی نظمیں پیش کر رہے تھے۔ اس وقت تک علی گڑھ تحریک سے حالی کا تعلق بھی قائم نہیں ہوا تھا لیکن مغرب کے علمی خزینوں سے استفادہ کرنے کے تئیں سرسید کی صلاح اب عام طور پر لوگ ماننے لگے تھے۔ محمد حسین آزاد کو بھی ایک موقع ملا کہ انگریزوں کی مدد سے مغرب میں شعر و ادب کے حلقے میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب نے 1865 میں جس 'انجمن پنجاب' کو Useful knowledge کی توسیع کے لیے قائم کیا، اس میں محمد حسین آزاد کی نظامت کے دوران جان پڑ گئی۔ 1867 میں انھوں نے تعلیم اور شعر و ادب کے موضوعات پر 23 لکچر دیے۔ خاص طور سے 5 اگست 1867 اور 19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جو خطبات دیے، وہ اردو کی جدید نظم کی تاریخ میں آئین کے طور پر مسلّم ہیں۔ یہیں سے نظمِ جدید کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل چراغ سے چراغ جلتے گئے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو کی نظمِ جدید مغرب کی نظموں کے زیرِ اثر ''انجمن پنجاب'' کی نشستوں میں سامنے آئی لیکن اردو میں موجود ماقبل سرمائے کا جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ جیسی نظمیں حالی اور آزاد نے پیش کیں، ویسی تخلیقات اردو میں پہلے سے موجود تھیں جنھیں نظم کی تاریخ کا حصہ نہیں ماننا کوتاہ نظری اور بے انصافی ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ نے جو موضوعاتی نظمیں کہیں، انھیں آخر نظم کی تاریخ سے کیوں ہٹایا جائے۔ خاص طور سے اپنی محبوباؤں کی تعریف میں بادشاہ نے جو مختصر نظمیں کہیں، وہ صدفی صد نظمِ جدید کے دائرۂ کار میں شامل ہونے کا جواز رکھتی ہیں۔ ابتدائی شعرا میں دکن میں ولی اور دہلی میں فائز دہلوی کے ہاں اچھی خاصی تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ فائز کے دیوان میں میلا، پنگھٹ اور تہواروں کے ساتھ قدرتی مناظر پر جو نظمیں موجود ہیں، انھیں اردو نظم کی تاریخ میں اَلقط نہیں کیا جاسکتا۔ فائز نے مغرب کے مقامیت والے رجحان کو بھی از خود اپنی نظموں میں آزما لیا تھا۔

اردو کی جدید نظم یا قدیم نظم اپنے عظیم ہنر مند شاعر نظیر اکبرآبادی کے کمالات سے استفادہ کیے بغیر اپنے معیار کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی تھی۔ نظیر اکبرآبادی اردو کی ادبی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں اور یہ فضیلت انھیں غزل گوئی کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ اُن کا اصل کارنامہ نظم نگاری سے متعلق ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے واقعتاً نظم کے موضوعاتی اور ہیئتی امکانات تلاش کیے۔ اس حقیقت کا اعتراف تکلیف دہ ہے لیکن یہ سچائی ہے کہ مغرب اور مشرق دونوں کے علمی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies

باوجود اردو میں بہ شمول حالؔی اور آزادؔ کوئی دوسرا ایسا نظم نگار سامنے نہیں آسکا جس کے پاس کائنات اور زندگی کا اتنا گہرا اور وسیع تناظر موجود ہو۔ عوامی رجحان اور تہذیب و ثقافت کی نیرنگیوں کو اپنی نظم گوئی کا حصہ بنا کر نظیؔر نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نہیں ملتی۔

19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزادؔ نے جدید شاعری کے موضوع پر جو لکچر دیا، اسی کے ساتھ اپنی ایک نظم 'شب قدر' بھی پیش کی۔ عام طور پر اسی تخلیق کو اردو کی پہلی جدید نظم قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس انداز کی موضوعاتی نظمیں اسماعیل میرٹھی اور حالؔی نے لکھی تھیں لیکن وہ تمام انگریزی نظموں کا ترجمہ تھیں۔ آزادؔ نے اپنی نظم سنانے کے بعد آئندہ ماہ کی نشست کے لیے 'برسات' موضوع سے نظمیں لکھنے کی دعوت دی۔ 30 مئی کے مناظمے میں حالؔی کی 'برکھا رُت' اور آزادؔ کی نظم 'ابرِ کرم' سامنے آئیں۔ آیندہ مشاعروں میں حالؔی، محمد حسین آزادؔ اور اسماعیل میرٹھی نے لگاتار نظمیں پیش کیں۔ محمد حسین آزادؔ نے تو بھی نو مشاعروں میں اپنی نظمیں سنائیں۔ اسی سے ان کے دیگر ہم عصروں میں نظم گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر اور اکبر الہ آبادی نے اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے نظم گوئی کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی میں اقبالؔ، چکبستؔ اور نظم طباطبائی نے نظم گوئی کی طرف پوری توجہ کی۔ نظم گوئی میں ہیئت کے سب سے زیادہ تجربے طباطبائی نے کیے۔ Sonnet اور نظمِ معریٰ کی طرف انھوں نے خصوصی توجہ کی۔ چکبستؔ نے مسدّس کا بہترین استعمال کر کے اردو کی قومی شاعری میں اپنی جگہ قائم کی۔ نظیر اکبرآبادی کے بعد اقبالؔ اردو نظم کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اقبالؔ نے بھی ہیئت اور موضوع دونوں کی سطح پر بہت واضح تبدیلیاں کیں۔ اقبال ہی نے یہ بتایا کہ نظموں میں فکر و فلسفہ کی بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔ اقبالؔ کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ نظموں کو عالمانہ موضوعات کی ترسیل کے لیے بھی آزمانے کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ مسدّس، مثنوی کے ساتھ ساتھ ترکیب بند اور ترجیع بند اقبالؔ کی مرغوب ہیئتیں ہیں۔ اقبالؔ کی نظم گوئی کے بعد ایک نئی نظم کا سلسلہ قائم ہو رہا تھا۔

اقبالؔ کے زمانے میں ہی جوشؔ ملیح آبادی نے قومی تحریک سے ترغیب پا کر ملک کے سماجی اور سیاسی مسئلوں پر نظم گوئی کی ابتدا کردی تھی۔ اپنے مخصوص انداز اور انقلابی لہجے نے جوشؔ کو مقبولیت عطا کی۔ جوشؔ کے ہم عصروں میں فراقؔ نے مختصر تعداد میں نظمیں کہیں لیکن ان کی امیجری Imagery اور انگریزی نظموں کے فنّی لوازمات کی وجہ سے فراقؔ اپنی بہترین غزل گوئی کے باوجود نظم کے بھی اہم شاعر ہیں۔ ان کی طویل نظمیں — "آدھی رات"، "جگنو" اور "ہنڈولہ" اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اسی زمانے میں اخترؔ شیرانی نے رومانی نظم گوئی کی طرف توجہ کی۔ غزل زدہ ماحول میں اخترؔ شیرانی ایسے پہلے شاعروں میں ہیں جنھوں نے نظم پر خود کو مرتکز رکھا۔ انھیں شاعرِ رومان کہا گیا۔ مغربی نظم کی مختلف ہیئتوں کو اردو میں متواتر استعمال کر کے اخترؔ شیرانی نے نظم گوئی کا ایک نیا باب قائم کیا۔ خاص طور پر سانٹ کے بہترین نمونے اخترؔ شیرانی کے یہاں ملتے ہیں۔ انگریزی میں رومانیت کے حوالے سے یادِ ماضی، سوز و غم، زندگی سے فرار اور احساسِ جمال کے ملتے جلتے موضوعات اہم رہے ہیں جنھیں اخترؔ شیرانی کی نظموں میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے بزرگ ہم عصروں میں عظیم الدین احمد نے بھی صنفِ نظم کے تعلق سے اچھے خاصے تجربے کیے اور سلسلۂ خیال اور

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies

موضوعاتی ارتکاز کو دھیان میں رکھتے ہوئے نظمیں کہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "گلِ نغمہ" کلیم الدین احمد کے پیش لفظ کی وجہ سے زیرِ بحث رہا لیکن بدقسمتی سے ان کی نظمیں زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں۔ اقبالؔ اور ترقی پسند شاعری کے درمیان مذکورہ چار شعرا ایک پُل کا کام کر رہے ہیں۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ جہاں شعر و ادب کی بنیادی زمین میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں اردو نظم نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ ترقی پسندوں کے مجموعی سرمائے کا محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا صدفی صد صحیح ہوگا کہ اردو نظم ایک نئے معاشرے میں چلی آئی۔ حالیؔ سے لے کر اقبالؔ تک نظم گوئی کا جو سلسلہ تھا، وہ ترقی پسند شعرا کے یہاں بدل گیا۔ اسی زمانے میں آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ کی سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ نظمیں مقبول بھی ہونے لگیں۔ ترقی پسندی کے آغاز کے دور میں جذباتیت کی وجہ سے جب کسی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ غزل جاگیردارانہ معاشرے کی پروردہ ہے تو غزل گو شعرا ایک سلسلے سے نظمیں کہنے لگے۔ کئی شاعروں نے اپنی غزلوں پر بے وجہ عنوان لگا کر انھیں نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی۔ فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدین، مجازؔ، علی سردار جعفری، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، سکندر علی وجد ایسے شعرا ہیں جنھوں نے ترقی پسند نظم گوئی کو بلندی عطا کی۔ انھی شعرا کی کوششوں سے اردو کی ادبی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا جب غزل گوئی کے مقابلے میں نظم نگاری زیادہ آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے ملک گیر سطح پر کوئی واضح سرگرمی نہیں دکھائی لیکن چند شعرا نے اردو میں نظم کے نئے تصور کو قائم کرنے میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ ابتدائی زمانے میں چلنے والے لوگوں نے ایک ایسی نظم کا خاکا اپنے سامنے رکھا جس میں زندگی کے انفرادی معاملات بھی توجہ کے ساتھ شامل کیے جا سکیں۔ یہ کہنا غیر مناسب ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا کا سماجی نقطۂ نظر محدود یا غیر سماجی تھا۔ اُس زمانے میں 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کا غیر ضروری تنازعہ بھی زوروں پر تھا۔ اس لیے سہل پسندی میں لوگوں نے یہ مفروضہ بنا لیا کہ ترقی پسند 'ادب برائے زندگی' کے علم بردار ہیں اور حلقۂ اربابِ ذوق کے لوگ 'ادب برائے ادب' کے قائل ہیں۔ کم سے کم اختر الایمان کی شاعری یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ غمِ ذات سے غمِ کائنات تک کا سفر کتنی سرعت کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم شعرا میں ن۔ م۔ راشدؔ، میراجیؔ، قیوم نظرؔ اور مجید امجدؔ کی شاعری اردو نظم کے بہترین دور سے عبارت ہے۔ خاص طور پر راشدؔ، میراجیؔ اور اختر الایمان جدید اردو نظم کے ایسے مثلث ہیں جن کے شاعرانہ کمالات پر غور کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان شعرا نے ہیئت کے اچھے خاصے تجربے کیے۔ حالاں کہ آزاد اور معرّیٰ نظم میں ان کے تجربے زیادہ کامیاب ہوئے۔ موضوع کو وسیع تناظر میں دیکھنا اور انسان کو اس کے اکیلے پن میں پہچاننا، دونوں پہلوؤں کو ان شعرا نے اپنی نگاہ میں رکھا۔ کہنے کو ترقی پسندوں کے ردِّ عمل میں حلقۂ اربابِ ذوق قائم ہوا لیکن نظم کے ارتقا کو پیمانہ بنائیں تو نئی نظم کا یہ زمانہ عہدِ زرّیں ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے 'سوغات' کا جدید نظم نمبر شائع کیا جسے اب بھی اردو نظم گوئی کا سب سے جامع انتخاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب اردو نظم کے بہترین دور کی یادگار ہے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abstl.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

جدیدیت کے زمانے میں جس نئی نظم کا خاکا کھینچا گیا، وہ حلقۂ ارباب ذوق سے ملتا جلتا تھا لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ زندگی کے تقاضے بدل رہے تھے۔ 1960 کے بعد اس نئی نظم کا ترقی پسند شعرا سے مقابلہ بھی نہیں تھا۔ خلیل الرحمان اعظمی، ابن انشا، منیر نیازی جیسے شعرا نے جس نئی نظم کے خدوخال طے کیے، وہ نہ صرف ترقی پسند نظم سے الگ تھا بلکہ حلقۂ ارباب ذوق کی نظم سے بھی اس کی ڈگر علاحدہ تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر نظم معرّیٰ ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ آزاد نظم اور پھر نثری نظم کے امکانات روشن ہونا شروع ہوئے۔ جدیدیوں کے زمانے میں نثری نظم کو علاحدہ صنف کی حیثیت سے جگہ ملی۔ بدلتی ہوئی زندگی پر جدیدیوں نے توجہ کی۔ نفسیاتی حقائق اور داخل کے شور کو پہلی بار پورے بھروسے کے ساتھ اس زمانے میں نظم گوئی میں جگہ ملی۔ وزیر آغا، شہریار، افتخار عارف، محمد علوی، ندا فاضلی، قاضی سلیم، باقر مہدی کو نظم نگار کی حیثیت سے اس عہد میں شناخت حاصل ہوئی۔ شاعرات کا ایک بڑا قافلہ بھی جدیدیت کے زمانے میں سامنے آیا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ تقریباً تمام جدید شعرا نے نظم گوئی کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھا اور خاصی تعداد میں نظمیں کہیں۔ ان شاعروں کی تعداد بھی بڑھنے لگی جنھوں نے نثری نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اردو کے موجودہ ادبی منظرنامے پر اکثر جدید شعرا سرگرم ہیں اور دورِ حاضر کی نظم گوئی، چند ایک نئے اور کم عمر شعرا کی نظم گوئی کو چھوڑ کر انھیں شاعروں کی مرہونِ منت ہے۔

نظم کی طویل تاریخ کے باوجود اردو شاعری کی مرکزی صنف غزل سے اس کا مقابلہ رہا۔ غزل کے سامنے کسی دوسری صنف کا چراغ نہیں جل سکا۔ نظم کے ارتقا کے مختلف مراحل پر توجہ دیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ نظم کی رفتار کئی بار سست پڑی یا وہ معدوم ہوئی۔ تواتر کے ساتھ بیسویں صدی سے پہلے اس صنف کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ البتہ بیسویں صدی میں کئی ایسے شعرا سامنے آئے جنھوں نے نظم گوئی کو اپنا اصل میدان بنایا۔ کئی شعرا نے تو ایک بھی غزل نہیں کہی۔ اس وجہ سے بیسویں صدی میں نظموں کی طرف رجحان بڑھا۔ اقبال، اختر الایمان، راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، سردار جعفری، محمد علوی، شہریار، ندا فاضلی، قاضی سلیم، علیم اللہ حالی، عین رشید جیسے نظم نگاروں کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اردو نظم روبہ ترقی ہے لیکن یہاں بھی جب غزل سے موازنہ ہوتا ہے تو بیسویں صدی کے غزل گو شعرا کی فہرست زیادہ طویل اور معتبر دکھائی دیتی ہے۔ ترقی پسندوں کے بعد نظم معرّیٰ کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا۔ آزاد نظم اکثر جدید شعرا کے یہاں موجود ہے لیکن سب سے زیادہ نثری نظموں کی طرف نئے شعرا کا رجحان ہوا۔ سہل پسندی میں شعرا نثر اور نظم کے بنیادی امتیازات کو سمجھنے میں اکثر ناکام ہوتے ہیں جس کے سبب ان کی نظمیں اچھی نثر بھی نہیں بن پاتی ہیں۔ شاید ایسی ہی تخلیقات کی وجہ سے نثری نظم کے لکھنے والے دیگر شعرا یا قارئین و ناقدین کی پھبتیاں برداشت کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں نظم کے روشن مستقبل پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا نظم کی کوئی ضرورت ہے؟ غزل کے ماحول میں جب تجربہ اور تبدیلیاں بھی جاری ہیں، آخر صنفِ نظم کے استعمال یا تخلیق کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں نظم کی فنی تشکیل کو سامنے رکھنا ہوگا۔ غزل پر کلیم الدین احمد نے جو سخت اعتراضات کیے ہیں اور بار بار نظم سے موازنہ کر کے یہ بتانے کی انھوں نے کوشش کی ہے کہ نظم کی افادیت اور ادبی ضرورت کو قائم رہنا ہے۔ نظم میں کسی خیال کو ترتیب وار اس کے مختلف اجزا کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ یہاں مضمون نویسی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

کے آداب یعنی ابتدا، ارتقا اور انجام کا دھیان رکھنا ہوتا ہے۔ غزل کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں اور وہاں خیال کا آخری نتیجہ پیش کرنا کافی ہوتا ہے۔ نظم کے مزاج کو بہ نظرِ توجہ دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کی شدید ضرورت اردو ادب کو ہے۔ مثنویاں، مراثی اور قصائد کے ختم ہونے کے بعد اردو شاعری میں کہاں کوئی ایسی صنف ہے کہ ضرورت پڑنے پر شاعر اپنے افکار کو ترتیب وار درج کر سکتا ہو۔ ہر شاعر کے ذہن میں، وہ فلسفی ہو یا نہ ہو، بعض خیالات موجود ہوتے ہیں جن کو وہ عوام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ پہلے قصیدے کی تشبیب میں یا مرثیے کے چہرے میں اور مثنویوں میں ایسے افکار کے لیے صنفی گنجائشیں تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد اردو کا شاعر اپنے مخصوص تصورات کو آخر کس شکل میں موزوں کرے؟

یہ ایک سچائی ہے کہ موجودہ دور میں دانش ورانہ فکر کے اظہار کے لیے نظم سے بہتر شاعری میں کوئی دوسری صنف موجود نہیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ ترقی پسندوں کے زمانے میں نظم کا زبردست فروغ ہوا۔ اختر الایمان کی نظموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس کچھ ایسی باتیں ہیں جو مختلف نظموں میں وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ فلسفی نہیں اور ہر وقت فلسفیانہ گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتے لیکن اپنی دانش ورانہ فکر کو وہ عام کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں نظم کے علاوہ شاید ہی کوئی صنف استعمال میں لائی جا سکے۔ جیسے جیسے موضوعاتی اور سماجی پیچیدگیاں بڑھیں گی، نظموں کی طرف جھکاؤ بڑھنے کے مواقع آئیں گے۔ نظم کا ہر دور میں غزل سے مقابلہ رہے گا۔ جیسے غزل بے پناہ مخالفتوں کے باوجود قائم رہی، اسی طرح نظموں کا وجود بھی قائم رہے گا۔

مختصر گفتگو

۱۔ اردو میں نظمِ جدید کے بانی کے طور پر کس کی شناخت ہے؟
۲۔ قلی قطب شاہ اور فائز کے یہاں کس طرح کی نظمیں ملتی ہیں؟
۳۔ سانٹ (Sonnet) اور نظمِ معرّیٰ کے لیے کس کی شہرت ہے؟ چکبست کی نظموں کی عمومی ہیئت کیا ہے؟
۴۔ پانچ ترقی پسند نظم گو شعرا کے نام لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ نظمِ جدید کے ارتقا میں انجمنِ پنجاب کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ نظم گوئی میں نظیر اکبر آبادی نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟
۳۔ ''اقبال کی نظم گوئی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔'' اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔
۴۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے نظم گوئی کے میدان میں کون سی خدمات انجام دیں، بتائیے۔
۵۔ نظم گوئی کی موجودہ سمت و رفتار کا جائزہ لیجیے۔
۶۔ اردو کے پانچ نظم نگاروں کی پانچ پانچ نظموں کے عنوانات لکھیے۔
۷۔ آپ کو نظم نگار کے طور پر کون سا شاعر پسند ہے؟ بتائیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

ناول نگاری

دنیا میں ناول کو صنعتی عہد کے فروغ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ قدیم تہذیبوں کے بطن سے داستان سرائی کی جو روایت دنیا کے مختلف گوشے میں موجود رہی، ناول کا ارتقا کہیں نہ کہیں ان روایتوں سے بھی ہم رشتہ رہا۔ موضوع کے اعتبار سے جاگیر دارانہ تہذیب کے اوّلین بکھراو کو سمیٹنے کے لیے ناول نے کوششیں کیں۔ تکنیک کی سطح پر بدلتی دنیا کے آثار بھی سب سے پہلے ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔ سترہویں صدی کے بعد کی دنیا میں جگہ جگہ ناول نگاری کی ابتدائی کوششیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس اور روس میں ناول نگاروں کا ایک ایسا سلسلہ سامنے آیا جس سے تھوڑے وقفے میں ہی اس صنف کو اعتبار حاصل ہوگیا۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے جدّت پسندی بہت تھی۔ جس کی وجہ سے اس صنف پر لوگوں کی عمومی توجہ ہوگئی۔ اس زمانے میں یہ عام بات تھی کہ شاعری عہدِ قدیم کی ترجمانی کرتی ہے اور ناول عہدِ جدید کی۔ لفظ ناول (Novel) کے لاطینی ماخذ "Novella" کا مفہوم بھی 'نیا' ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ناول کو نئی شے کے طور پر قبولیت ملی۔

اردو میں فارسی کے توسط سے داستانی سلسلے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے مختصر داستان گوئی کی طرف ہمارا دھیان کھینچا۔ ہندستانی معاشرے میں کسی صنعتی انقلاب یا بڑے سائنسی تغیر و تبدّل کا کوئی نشان اٹھارھویں صدی یا نصفِ اوّل انیسویں صدی میں دکھائی نہیں دیتا۔ شاید اسی لیے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک تو داستانوں کی مقبول فضا بندی قائم رہتی ہے۔ 1857 کے انقلاب اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کی جارحیت نے شاید پہلی بار ہندستانی سماج کو بالخصوص مسلمانوں کو نئے انداز میں غور و فکر کے لیے تیار ہونے کا موقع عطا کیا۔ اسے محدود معنوں میں نشاۃ الثانیہ یا نئی بیداری بھی کہتے ہیں۔ اہلِ اردو کے لیے داستانوں سے الگ عہدِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ناول جیسی صنف کے سائے میں پہنچنا، اسی دور میں ممکن ہوسکتا تھا۔ سماجی ضرورتیں اور نئے سیاسی مسائل ہمیں مجبور کر رہے تھے کہ ادب کو گل و بلبل کے قصّے کہانیوں کی جگہ زندگی کے حقائق اور سماجی مسائل کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے۔ سرسیّد نے کوئی تحریک نہیں شروع کی تھی لیکن ان کی یکے بعد دیگرے کتابیں قومی مسائل کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔ سرسیّد جس سال برطانیہ کے لیے روانہ ہوئے، اُسی سال یعنی 1869 میں سرسیّد کی متوقع تحریک کے سرگرم رکن دہلی کی عظیم المرتبت علمی شخصیت ڈپٹی نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' نام سے قصّے کی ایک ایسی کتاب لکھی جسے بعد کے زمانے میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا۔ نذیر احمد نے چھے اور ناول رقم کیے۔ تمام کتابوں میں قصّہ گوئی کی تان، قوم کی زبوں حالی اور اصلاحِ معاشرہ پر ٹوٹتی ہے۔ ایسے کسی قصّے کی روایت نذیر احمد کو اردو میں نہیں ملی تھی۔ بلاشبہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

انھوں نے بعد میں انگریزی ناولوں اور تمثیلوں سے فائدہ اٹھایا۔ اِس کے باوجود اس صنف کا ابتدائی خاکہ ان کی عالمانہ تخلیقی صلاحیت کی نگرانی میں انجام پایا۔

سرسید کی طرح ہی نذیر احمد کے دل میں مسلمانوں کی خستہ حالی کا نقشہ تھا۔ دونوں کے تصورات میں بعض مقامات پر بعدِ مشرقین ہے جس کا اظہار 'ابن الوقت' کے صفحات پر ہوتا ہے۔ نذیر احمد یہ مانتے تھے کہ مذہب سے دوری کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اخلاقی گراوٹ آئی ہے۔ اس لیے جدید تعلیم کے ساتھ مذہبی اعمال پر بھی وہ توجہ دینے کی وکالت کرتے تھے۔ ان کے ناولوں میں سب سے بڑا موضوع یہی ہے کہ معاشرے کی جملہ خرابیوں کی وجہ ہماری بداعمالیاں ہیں۔ 'توبۃ النصوح' میں گھریلو زندگی میں تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی گراوٹ کو انھوں نے واضح کیا۔ انگریزوں کے اثر سے جو برائیاں پیدا ہو رہی تھیں، نذیر احمد اُن پر اپنی واضح رائے رکھتے ہیں۔ انھیں وجوہات سے ان کے تمام ناول___ 'مراۃ العروس'، 'توبۃ النصوح'، 'ابن الوقت'، 'بنات النعش'، 'رویائے صادقہ'، 'ایامیٰ' اور 'فسانۂ مبتلا' بے حد مشہور ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں نذیر احمد کے رنگ میں ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ انیسویں صدی میں جتنے ناول نگار سامنے آئے، سب پر کسی نہ کسی جہت سے نذیر احمد کے گہرے اثرات قائم ہوئے۔

شاد عظیم آبادی کے نام سے ''صورۃ الخیال'' (ناول) شائع ہوا۔ اس کی تین جلدیں مزید سامنے آئیں۔ تصنیفی حیثیت پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ شاد ان ناولوں کے مصنف ہیں یا مؤلف، یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی لیکن یہ سچائی ہے کہ ان ناولوں پر نذیر احمد کا اصلاحی رنگ غالب ہے۔ حالی کا ناول ''مجالس النسا'' اور رشیدۃ النسا کا ناول ''اصلاح النسا'' تو پورے طور پر نذیر احمد کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ''اصلاح النسا'' میں بار بار نذیر احمد کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ مصنفہ نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں کے لیے انھیں دعا دیتی ہیں۔ اصلاح کا عمومی انداز اس وجہ سے بھی اس عہد میں دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ سرسید کی تحریک شباب پر تھی۔ پورے ہندستانی معاشرے میں اصلاح اور تغیر و تبدل کے موضوعات سکۂ رائج الوقت تھے۔ اسی لیے ہر ناول نگار کے یہاں اپنے عہد کی ضرورتوں کے تحت لکھنے کا کام کہیں نہ کہیں اصلاحی رنگ کی طرف بڑھ جاتا تھا۔

اُسی زمانے میں عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کا قدرے مختلف نگار خانہ سجایا۔ شرر تاریخ کے حوالے سے اپنی باتیں کہتے ہیں اور سرشار تہذیب و ثقافت اور قدروں کو بنیاد بناتے ہیں۔ 1857 کے بعد ہندستانی سماج میں احساسِ زیاں پر سب متفکر تھے۔ حکومت ختم ہونے کا احساس اور غیر اقوام کے زیرِ انتظام جینے کی بے بسی اُس زمانے میں عام طور پر غور و فکر کا موضوع ہے۔ عبدالحلیم شرر تاریخ کے مہتم بالشان ادوار کی طرف اپنے قصے کی طنابیں کھینچتے ہیں۔ شرر کا سب سے مرغوب موضوع مسلمانوں کی افواج کے ذریعے یورپ کے ممالک کی تاراجی ہے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی یہاں میل جول کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ ایک رومانیت اپنے آپ ان قصوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد، سرسید اور حالی سے شرر کا مزاج علاحدہ نہیں لیکن انھوں نے اپنے ناولوں کے موضوعات ایسے رکھے جن کا براہِ راست تعلق ہندستانی معاشرے سے کم تھا لیکن شعور اقدار وہی تھا۔ عبدالحلیم شرر کے ناول بہت پڑھے گئے اور ان کی قدر و قیمت وقت سے طے ہوگئی۔ اس کی وجہ تاریخ اور مذہب کا وہ رومانی تصور تھا جو

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies

وقتِ زوال اقوام کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

رتن ناتھ سرشار نے ''فسانۂ آزاد'' لکھ کر ایک تہذیبی مرقع پیش کر دیا۔ ناقدین کا ایک طبقہ اس کی طوالت کی وجہ سے اسے داستان کے طور پر متعارف کراتا ہے لیکن تہذیب وثقافت کا جو گہرا شعور سرشار کے یہاں موجود ہے، وہ عہدِ جدید کا عطیہ ہے۔ جس کی ترجمانی کے لیے ناول کو فضیلت حاصل ہوئی۔ نذیر احمد اور شرر کی روایات کے سامنے سرشار کی تحریروں کو رکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کے مزاج کے اعتبار سے سرشار سب سے زیادہ پختہ شعور کے مالک ہیں۔ اکثر سرشار کو اُن کی ظرافت کے لیے داد فراہم کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ سرشار اپنے بہترین سماجی تہذیبی شعور کی بدولت اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسی جگہ پر متمکن ہیں جہاں سے ناول کا عہدِ جدید شروع ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تکنیک کا جو نیا تصور اس زمانے میں آیا، سرشار اپنے ناولوں میں اسے کامیابی کے ساتھ نہیں آزما سکے۔ کرداروں کی تراش خراش اور قصے میں ایجاز کا ہنر بھی سرشار کے پاس کم تھا لیکن ناول کی روح یعنی اپنے عہد کی ترجمانی اور تہذیب وثقافت کا شعور ایسے اجزا ہیں جن کی وجہ سے سرشار کو اردو قصہ گوئی کی تاریخ کی ایک عبقری (Legendary) شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ طنز وظرافت کو بنیاد بنا کر ناول کو اپنے عہد کا ترجمان بنا دینا سرشار کا ایک کارنامہ ہے لیکن مثالیں اُسی عہد میں دوسرے لکھنے والوں کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کے اڈیٹر منشی سجاد حسین نے کئی ایسے ناول لکھے جن کے کردار ظرافت کے پردوں سے اڑتے ہیں۔ حاجی بغلول، کایا پلٹ اور میٹھی چھری ناولوں میں ظرافت کے پردے میں سماجی حقائق کا زبردست اظہار ملتا ہے۔ اس عہد میں قاری سرفراز حسین عزمی کا ناول ''شاہدِ رعنا'' سامنے آیا۔ طوائف کی زندگی پر یہ پہلا ناول ہے۔ عزمی کی زبان مرصّع ہے۔ کئی ناقدین نے 'شاہدِ رعنا' اور 'امراو جان' میں مماثلتیں دکھائی ہیں اور محمد ودیانے پر یہ الزام بھی رسوا کے سر آیا کہ 'شاہدِ رعنا' کے جواب کے طور پر رسوا نے 'امراو جان ادا' تصنیف کی۔ اس کا یہ بھی مطلب ہوتا ہے کہ ''امراو جان ادا'' کا نقشِ اوّل ''شاہدِ رعنا'' ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ''شاہدِ رعنا'' اردو ناول کی تاریخ کی ایک غیر اہم کڑی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں قرار دی جا سکی۔ 'مراۃ العروس' سے لے کر ''شاہدِ رعنا'' تک تقریباً تین دہائیوں میں اردو ناول نے مواد اور فن کی کئی منزلیں سر کیں۔ لیکن انیسویں صدی میں جس طرح عہدِ نو کے تقاضے ہمارا انتظار کر رہے تھے، وہاں تک اردو ناول کو پہنچنے میں دیر ہوئی۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار میں سے کوئی ایک بھی اردو کے نئے ناول کا خاکہ نہیں کھینچ سکا۔ اس کے لیے اردو کو 1898 تک کا انتظار کرنا پڑا۔

''امراو جان ادا'' کی اشاعت سے اردو ناول کا عہدِ جدید شروع ہوتا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے ''شریف زادہ''، ''ذات شریف''، ''افشاے راز'' جیسے کئی ناول لکھے لیکن انھیں بقاے دوام ''امراو جان ادا'' کی وجہ سے حاصل ہوا۔ یہ کہنا پورے طور پر صحیح نہیں کہ مرزا رسوا کے یہاں مقصدی ناول نگاری نہیں ہے۔ ''امراو جان ادا'' میں اصلاح اور تبلیغ کے بھرپور مواقع ہیں۔ اس کے باوجود اس ناول کو مقصدی نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا ہادی رسوا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موضوع، تکنیک اور فکر وفن کے برتاو میں اس توازن کا استعمال کیا جس کی وجہ سے شہکار تیار ہوتے ہیں۔ کہنے کو یہ کہانی ایک طوائف کی زندگی سے متعلق ہے، اُسی طرح قصہ کا ماحول بھی اودھ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ناول نگار کا نظریۂ کائنات وسیع اور بالیدہ ہے۔ اردو میں یہ پہلا موقع تھا جب ناول

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in) Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

نگار اس بات کو ٹھیک طریقے سے سمجھ رہا تھا کہ ناول میں پس منظر کا کتنا کام ہے۔ سرشار تہذیب و ثقافت کی جلوہ سامانیاں لُٹانے میں انتخاب اور قطع و برید کے فن سے دور ہو جاتے ہیں۔ مرزا رسوا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح اپنا ناول تیار کیا۔ کوئی جُز حد سے بڑھا ہوا نہیں۔ نہ غم کی آنچ بہت تیز ہے اور نہ تفریح کی لے پنچم تک پہنچتی ہے۔ خود کلامی ہو یا مکالمہ؛ سماج کی کراہیتوں کا بیان ہو یا عہدِ گذشتہ کے کبھی دل کش اور کبھی غم انگیز نظارے، کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہے جہاں مرزا رسوا نے ایجاز و اختصار اور فنی پختہ کاری کا ثبوت نہیں دیا ہو۔ میر امن، غالب اور سرسیّد نے اردو نثر میں جدّت پسندی کی جو شمعیں مختلف اوقات میں جلائی تھیں، اُس کے بعد فکشن میں ایک ایسے ہُنر ور کی ضرورت تھی جو تمام نئے تصوّرات کو اپنی تخلیق میں ڈھال دے۔ مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر اردو ناول کی تاریخ میں پہلا سنگِ میل قائم کیا۔

ناول کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے مرزا رسوا نے جس عہدِ جدید کا خاکہ کھینچا، اس کا نقطۂ عروج پریم چند کے ناولوں میں سامنے آتا ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' کے فوراً بعد پریم چند نے ناول نگاری شروع کی۔ ''اسرارِ معابد'' سے ''منگل سوتر'' تک پریم چند کے پندرہ ناول ہیں۔ اس تعداد میں ''گئودان'' اور ''میدانِ عمل'' جیسے شہکار بھی شامل ہیں۔ پریم چند کو ہندستان کی قومی تحریک کا وہ پس منظر ملا جس کے سہارے انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے عہد کا نبض پیما بنایا۔ سرشار اور رسوا سے پریم چند ان معنوں میں مختلف ہیں کہ انھوں نے بدلتے ہوئے سماج کے انتشار اور اضطراب کو پہلی بار قصّہ گوئی کا موضوع بنایا۔ پریم چند سے پہلے ہندستانی سماج میں بنگلہ کے چند ناول نگار بالخصوص بنکم چندر چٹرجی نے ہندستان کے دیہی سماج کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تھا۔ بنگلہ کے لکھنے والوں سے پریم چند اس معاملے میں بالکل الگ ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر جاگیردارانہ تہذیب کو بدل دینے والا ہے۔ جبکہ ایک مدّت تک بنگلہ سماج بھدر لوک کے موہ جال سے نکل ہی نہیں پایا۔

پریم چند کے یہاں اردو ناول نہ صرف اپنی موضوعاتی اور فنی تکمیل کی حدوں تک پہنچتا ہے بلکہ اب اردو ناول دوسری زبانوں کے شہکاروں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ''نرملا''، ''چوگانِ ہستی''، ''میدانِ عمل''، ''بازارِ حسن'' اور ''گئودان'' جیسے ناولوں سے پریم چند نے اردو قصّہ گوئی کو وہ بلندی عطا کی جس کے مقابل پوری بیسویں صدی میں کوئی دوسرا لکھنے والا سامنے نہیں آ سکا۔ ایک ایسی نثر پریم چند کے یہاں قصّے کی زبان میں ڈھلتی ہے جس میں کوئی تصنّع اور بناوٹ نہیں اور تعلیم یافتہ سے لے کر عام لوگوں کے بیچ وہ زبان کام میں آ سکتی ہے۔ مظلوموں، پسماندہ افراد، جدّ و جہد میں شامل لوگ اور استحصال کا شکار بے بس کسان اور مزدور، عورتیں — ان طبقات کو پریم چند نے اپنے فکشن میں اس طرح جگہ دی کہ انھیں آزادی سے قبل کے مظلومین کا سچّا ہمدرد اور دکھی ہندستانیوں کا سب سے پسندیدہ مصنّف مانا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے تھوڑے سے ادیب اور شاعر ہیں جنھیں اپنی قوم کا نمایندہ سمجھا جاتا ہے۔

پریم چند کے بعد اور ترقّی پسند ناول نگاروں کے بیچ رومانیت کے لہجے کی بازیافت کا دور ہے۔ قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھ پوری اردو کے دو اہم رومانی ناول نگار ہیں۔ پریم چند کی زندگی میں ہی اُن سے مختلف انداز کے لکھنے والے ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، فیاض علی اور شوکت تھانوی رومانیت کو ظرافت کی حدوں تک لے گئے۔ ان ناول نگاروں

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

کا نقطۂ نظر باغیانہ یا ترقی پسندانہ بھی ہے۔ زندگی کی بدلتی قدروں پر ان لکھنے والوں نے توجہ کی۔ ترقی پسند ناول کی پشت پر پریم چند اور رومانی یا مزاحیہ لکھنے والے مصنفین دونوں کے گہرے اثرات رہے لیکن یہ تجرباتی دور ہے۔ اس لیے اس دوران کوئی ایسا بڑا لکھنے والا سامنے نہیں آسکا جس کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اردو ناول پریم چند سے آگے بڑھا۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں سب سے پہلے سجاد ظہیر کا واحد ناول ''لندن کی ایک رات'' 1937 میں شائع ہوا۔ تکنیک کے اعتبار سے ''لندن کی ایک رات'' واقعتاً اہم ناول ہے۔ اس ناول کے ذریعے سجاد ظہیر نے پہلی مرتبہ اردو میں شعور کی رَو کی تکنیک کا استعمال کیا۔ ''گئودان'' نے موضوعاتی اعتبار سے ناول کی جو مکمل دنیا قائم کی تھی، اس میں کوئی اضافہ نہیں۔ سجاد ظہیر نے فکشن میں کچھ خاص زیادہ کام بھی نہیں کیا۔ اُن کی شہرت کا دارومدار اصل میں اُن کی تنظیمی استعداد کی وجہ سے ہے۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی ترقی پسندوں میں خاصے مقبول ناول نگار ہیں۔ ''شکست'' کرشن چندر کا سب سے اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے جس میں فنی اور ترقی پسندانہ فکر دونوں کا توازن ملتا ہے۔ کرشن چندر نے یہ ناول 1943 میں لکھا۔ بعد میں ''جب کھیت جاگے'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ ''ایک گدھے کی سرگذشت'' سے ظرافتی ناولوں کا ایک علاحدہ منظر نامہ سامنے آیا لیکن فنی اعتبار سے ''شکست'' کرشن چندر کی ادبی فتح ہے۔ عصمت چغتائی نے ضدّی ناولٹ سے ابتدا کی لیکن 1947 میں ''ٹیڑھی لکیر'' کی اشاعت نے اُنھیں اردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں شامل کیا۔ ''ٹیڑھی لکیر'' نفسیاتی دروں بینی اور شخصیت کے پیچ وخم کو گہرائی سے سمجھنے کے معاملے میں اردو کا عظیم ناول ہے۔ اس کے بعد 'ایک قطرۂ خون' نام سے عصمت نے ایک ناول لکھا لیکن اُنھیں ادبی عظمت ''ٹیڑھی لکیر'' کی وجہ سے ملی۔ ''گئودان'' کے بعد 1947 تک جو تخلیقات سامنے آئیں، اُن میں ''ٹیڑھی لکیر'' سب سے بڑا ناول ہے۔ ابتدائی ناول ہونے کے باوجود عصمت، کرشن چندر کی طرح ہی اپنے قائم کردہ نشان سے پوری ادبی زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکیں۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں عزیز احمد نے بڑی تعداد میں ناول لکھے۔ 'ہوس'، 'مرمر اور خون'، 'گریز'، 'آگ'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' اور 'خدنگِ جستہ' عزیز احمد کے وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے ایک نقاد اور مفکر کے ساتھ ساتھ وہ بہترین ناول نگار بھی ہیں۔ عزیز احمد، کرشن چندر یا دوسرے ترقی پسندوں کی طرح سماجی حقیقت نگاری کو ناول کی بنیاد نہیں بناتے۔ نفسیاتی پیچ اور جنسی کج رویوں کا رشتہ عصری زندگی سے جوڑتے ہوئے عزیز احمد نے اردو ناول کی ایک بالغ نظر دنیا خلق کی۔ یوروپی ناولوں کا مطالعہ بھی ان کے کام آیا۔ جدید تعلیم یافتہ معاشرے کی اتھل پتھل کو بھی نہایت باریکی سے انھوں نے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ احسن فاروقی کے مشہور ناول 'شامِ اودھ' کو اس وجہ سے ایک اہم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ تہذیبی مطالعات کا نیا زمانہ اُن کے ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

1947 کے آس پاس بڑی تعداد میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں ہندستان کی قومی تحریک سے ابھرنے والے مسائل اور تقسیمِ ملک کے اثرات زیرِ بحث آئے تھے۔ آزادی ملنے سے پہلے سے ہی ایک طبقے کے ذہن میں خوابوں کے بکھرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ترقی پسند ناول نگاروں میں ایسے لوگ زیادہ تھے جنھیں فیض کی زبان میں یہ کہنے کا موقع ملا کہ ''یہ داغ داغ اجالا،

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

یہ شب گزیدہ سحر" یا" چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"۔ ابراہیم جلیس کے دو مشہور ناول "چور بازار" اور "چالیس کروڑ بھکاری" نئے ملک کی تعمیر کی رکاوٹوں کو افشا کرتے ہیں۔ اُس عہد میں شوکت تھانوی نے بھی خاصی تعداد میں ظریفانہ ناول لکھے۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں بدلتے ہوئے حالات سے بے اطمینانی اور اپنی تمناؤں کے ٹوٹ کر بکھرنے کی کیفیات بھی شامل ہیں جن سے بعض تحریروں کی معنویت بڑھ جاتی ہے رقم کی گئی ہیں۔ سماجی مسئلوں کو اس سے پہلے نیم ظریفانہ انداز میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بھی اپنے ناولوں 'خانم' اور 'چمکی' میں پیش کیا تھا۔ ترقی پسند ناولوں کا روشن خیالی کو قدر حیات بنانے کا یہ سلسلہ تھا جس کی ظرافت نگاری کے حوالے سے صنف ناول میں ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی ترجمانی کر رہے تھے۔

آزادی اور تقسیم ملک کا ایک بڑا المیہ فرقہ وارانہ فسادات ثابت ہوئے۔ اردو کے معروف اہل قلم اس میں سرگرمی سے اپنے انسانی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے پائے گئے۔ کرشن چندر کا ناول "غدار"، رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا"، قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ "یا خدا" ایم اسلم کا "رقص بسمل" اور رشید اختر کا "1947" ایسے فن پارے ہیں جنھیں فسادات کے انسانیت سوز مسئلوں کو اپنے صفحات پر اتارنے کے لیے گہرائی سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تمام تحریریں 48-1947 کے دوران شائع ہوئیں۔ وہ زمانہ برصغیر کے لیے امتحان کا تھا۔ مذہب اور جغرافیائی حد بندیوں کو بنیاد بنا کر جو انسانیت سوز اور ہیبت ناک واقعات رونما ہوئے، وہ ہندستانی تاریخ کے سیاہ اوراق ہیں۔ اتفاق سے اُس ابتدائی دور میں ناول نگاروں نے جذباتی سطح پر جیسی سرگرمی دکھائی، اُس کے مقابلے فکری بالیدگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جذباتیت کی وجہ سے ہی مذکورہ تمام ناول کامیاب ثابت نہیں ہو سکے۔ کبھی اردو کے اہم ناولوں کی فہرست میں انھیں شامل نہیں کیا جا سکا۔ البتہ اُن کی تاریخی حیثیت قائم رہتی ہے۔

آزادی کے بعد اُس نسل نے ابتدائی دو دہائی میں سب سے زیادہ ناول لکھے جس کی پرورش و پرداخت ترقی پسند تحریک کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس دوران قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین بڑے ناول نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں سفینۂ غم دل، میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، چاندنی بیگم اور گردش رنگ چمن ایسا علمی اور تکنیکی طلسم ہیں جن کی وجہ سے قرۃ العین حیدر کو اردو ناول کی تاریخ میں ایک انوکھا اور مکمل باب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا آسان ہے کہ قرۃ العین حیدر نے تاریخ اور تہذیب کو موضوع بنایا اور "شعور کی رو" تکنیک کو اپنایا۔ ناول نگار کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا یہ ظاہری جہانِ معنی ہے۔ جس طرح پریم چند نے اپنے عہد میں ناول نگاری کا چہرہ بدل دیا تھا، بلا شبہ قرۃ العین حیدر نے اردو ناول کی ایک نئی کائنات خلق کی۔ اگر اُن کے ناولوں میں تاریخ ہے تو وہ تاریخ کی شکل میں نہیں ہے۔ تہذیب و ثقافت کے مضمرات داخلِ دفتر ہیں تو انھیں آپ تہذیبی تاریخ سمجھنے کی بھول نہ کریں۔ ایک بہترین تخلیقی فن کار کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا یہ بہترین کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں غیر افسانوی عناصر کو اپنی ناول نگاری کے توسط سے اردو ادب میں اس طرح داخل کیا کہ اُن کے بعد اسے قرۃ العین حیدر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

"آگ کا دریا" ناول کے بعد اگلے پندرہ برسوں تک اردو میں بہترین ناول ایک کے بعد ایک آتے گئے۔ "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین) 'خدا کی بستی' (شوکت صدیقی)، 'علی پور کا ایلی' (ممتاز مفتی)، 'آنگن' (خدیجہ مستور)

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

'تلاشِ بہاراں' (جمیلہ ہاشمی)، 'ایک چادر میلی سی' (راجندر سنگھ بیدی)، 'لہو کے پھول' (حیات اللہ انصاری) 'بہت دیر کردی'، (علیم مسرور)——اردو ناول کی تاریخ میں سب سے طاقت ور نسل کے طور پر انھیں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر ناول نگاروں نے کئی دوسرے ناول بھی لکھے۔ ہندستان کی تحریکِ آزادی، مجاہدین کی قربانیاں، نئے ملک کی تعمیر کا خواب، فرقہ وارانہ فسادات، ناامیدی میں مقامی سطح پر جدّ وجہد کی تحریکیں اور آزادی کے بعد داخلی سطح پر باشندوں کا بکھراو، مختلف اوقات میں سیاسی کش مکش اور اختلافات میں شدّت جیسے موضوعات نے مذکورہ ناول نگاروں کی تحریروں کو ایک زندۂ جاوید پس منظر عطا کیا۔ اسی بنیاد پر اردو ناولوں کا سب سے زرخیز دور سامنے آیا۔ اس نسل کے فن کاروں نے بعد میں جو چند اہم ناول لکھے، اُن میں ''نادار لوگ''، ''نشیب''، ''ندی'' (عبداللہ حسین) ''جانگلوس'' (شوکت صدیقی)، ''زمین'' (خدیجہ مستور)، ''دشت سوز''، آبلہ پا (جمیلہ ہاشمی)، ''مدار'' (حیات اللہ انصاری) اہم ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے بعد عبداللہ حسین کو ناول نگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہوا۔ ''اداس نسلیں'' کو عام طور پر اردو کے تین بڑے ناولوں (گئودان، آگ کا دریا اور اداس نسلیں) میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر تاریخ اور تہذیب کے پردوں پر اپنے ناولوں کے صفحات سجا رہی تھیں، اُسی عہد میں عبداللہ حسین سماجی حقائق اور جذبوں کی تخلیقی دنیا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ''اداس نسلیں'' اسی رفتہ رفتہ جدید ہندستان کا نوحہ بنا جس طرح غلام ملک میں گئودان کو اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ اپنے عنوان کے سوز کو عبداللہ حسین نے اس ناول میں تقسیم ملک کے احوال رقم کرتے ہوئے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ عبداللہ حسین کا دوسرا بڑا ناول ''نادار لوگ'' تقریباً تیس برسوں کے بعد شائع ہوا۔ اداس نسلیں جیسی ضخامت کے باوجود یہ ناول اہلِ اردو کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکا۔ پاکستان میں کئی کئی اشاعتیں ہوئیں لیکن اداس نسلیں نے جو معیار قائم کیا تھا، اس کے بعد جو دوسرے ناول لکھے گئے، ان میں خدیجہ مستور کا شہکار ''آنگن'' بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کسی خاتون نے مکمل سیاسی ناول نہیں لکھا۔ آنگن میں مصنفہ نے ہمارے گھروں کے درمیان ملک کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو قید کر کے بہترین تجربہ کیا۔ انسان کو جذبوں کی باریک سطح پر کیسے پہچانا جائے، اس کا جو دل پذیر انداز خدیجہ مستور نے پہچانا ہے، وہ ان سے مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے اس ناول کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جنھیں لوگ بار بار اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں پڑھتے ہیں۔

''آگ کا دریا'' کی اشاعت سے 'لہو کے پھول' تک جس طرح اردو ناولوں کا سب سے زرخیز زمانہ سامنے آیا۔ اسی طرح ایک وقفے کے بعد ناول نگاری میں سرگرمی کا زمانہ 1988 میں عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ تقریباً ۱۸ ربرسوں میں ناول نگاری کے منچ پر سناٹا چھایا رہا اور اس سناٹے کو توڑتے ہوئے 1988 میں ''دوگز زمین'' اور 1989 میں ''پانی'' (غضنفر) اور مکان (پیغام آفاقی) منظرِ عام پر آئے۔ تینوں ناولوں پر گفتگو تقریباً ایک ساتھ شروع ہوئی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ گذشتہ ۱۵ ربرسوں میں پچاس سے زیادہ ناول لکھے جا چکے ہیں۔ عبدالصمد نے ''دوگز زمین'' جیسا ناول پیش کیا۔ ''دوگز زمین'' اور 'خوابوں کا سویرا' ناولوں کے بعد عبدالصمد کے موضوعات کی حدود واضح ہونے لگی تھیں۔ لیکن ''مہاتما''

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اور ''دھمک'' سے انھوں نے سماجی مسائل کے نئے ابعاد تلاش کیے۔ عبدالصمد زبان کے استعمال میں فن کارانہ سحر طرازی کے گر سے ابھی تک واقف نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے باوجود گذشتہ دو دہائیوں میں جو ناول سامنے آئے ان میں ''دو گز زمین'' سے بہتر اور مکمل کوئی تخلیقی کارنامہ سامنے نہیں آیا۔

ہم عصر ناول نگاروں میں غضنفر نے سب سے زیادہ ناول لکھے۔ پندرہ برسوں میں اُن کے سات ناول سامنے آئے ــــ 'پانی'، 'کینچلی'، 'کہانی انکل'، 'مم'، 'دویہ بانی'، 'فسوں' اور 'وش منتھن' سب مختصر ناول ہیں۔ زبان کی سطح پر غضنفر کے یہاں اچھی خاصی تجربہ پسندی ہے۔ ایک ناول سے دوسرے ناول پہنچتے ہوئے اُن کی موضوعاتی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے وہ نئے نئے تجربے کرتے ہیں لیکن اب تک اُن کے یہاں کوئی ایسا بڑا تخلیقی شہ پارہ وجود میں نہیں آسکا ہے جسے بڑے ناولوں کی صف میں رکھا جاسکے۔ مشرّف عالم ذوقی نے بھی خاصی تعداد میں ناول لکھے۔ 'نیلام گھر'، 'بیان'، 'مسلمان' اور 'پوکے مان کی دنیا' ناول قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے صحافتی انداز کی وجہ سے ذوقی ناقدین کے درمیان قابلِ قبول نہیں بن سکے ہیں۔ پیغام آفاقی نے ایک ناول 'مکان' لکھ کر جو شہرت حاصل کی، وہ بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آتی ہے۔ جدید شہری نظام کے مسئلوں پر اردو میں زیادہ ناول نہیں لکھے گئے۔ پیغام آفاقی نے اس موضوع کو بنیاد بنا کر ایک یادگار ناول لکھا۔

سیّد محمد اشرف نے 'نمبردار کا نیلا'، انور خاں نے 'یادبسیرے' اور 'پھول جیسے لوگ' لکھ کر اس روایت کو قائم رکھا جس میں اکثر افسانہ نگار ناولوں کی طرف بھی آتے ہیں۔ حسین الحق نے 'بولومت چپ رہو'، 'فرات'، شفق نے 'کانچ کا بازی گر'، 'بادل' اور 'کابوس'، شموئل احمد نے 'ندی' اور 'مہاماری' جیسے ناول لکھے۔ صلاح الدین پرویز کا 'نمرتا'، 'ایک دن بیت گیا'، 'سارے دن کا تھکا ہوا پُرش'، 'آئڈنٹٹی کارڈ' اور 'دی وارجرنل' شائع ہوئے۔ پرویز کے فن پر باتیں کم ہوئیں اور دوسری وجوہات سے تنازعات زیادہ ہوئے۔ اُن کے یہاں اظہار میں جو شاعرانہ جھکاو ہے، وہ خاصے کی چیز ہے لیکن مکمل تخلیقی شہ پارہ بنانے میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ عشرت ظفر کا 'آخری درویش' مظہرالزماں خاں کا 'آخری داستان گو' بھی اسی دوران شائع ہوئے۔ بزرگوں میں اقبال مجید نے 'کسی دن' اور 'نمک' ناول شائع کیے۔ الیاس احمد گدی کا ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول 'فائر ایریا' 1980 کے بعد کے ناولوں میں بعض حلقوں میں بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسمان'' اٹھارویں اور انیسویں صدی کو سامنے رکھ کر تہذیبی اور ثقافتی گوشوارہ تیار کرنے کی عالمانہ کوشش ہے۔ اب اگر یہ بہترین تخلیقی شہ پارہ تسلیم کرلیا جائے تو ناول کی حیثیت سے اسے یادگار کہا جاسکتا ہے۔

اردو ناول کی تاریخ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ناول کا سفر خطِ مستقیم کی طرح ہموار نہیں ہے۔ کئی بار اچھے خاصے وقفے تک سناٹا چھایا رہا اور کئی بار تھوڑے سے وقفے میں کئی اہم ناول سامنے آئے۔ کسی کسی زمانے میں ناول نگاروں کی بھیڑ پیدا ہوگئی اور کبھی چند لکھنے والوں پر ناول کا قافلہ منحصر رہا۔ نذیر احمد سے لے کر موجودہ زمانے تک ناول نگاری کی سمت و رفتار، اسی سلسلہ سے جوڑ کر دیکھی جاسکتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں نذیر احمد سے مرزا رسوا تک ناول نگاروں کی یلغار ہے۔ بیسویں صدی میں ترقّی پسند تحریک سے پہلے پریم چند کے علاوہ کوئی بڑا ناول نگار اس عہد میں دکھائی نہیں دیتا۔ ترقّی پسندوں نے بھی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

ناول نگاری کے باب میں اپنے بڑے کام تحریک کے عہدِ شباب میں نہیں انجام دیے بلکہ اُن کے ہاں ناول نگاری کا زرّیں عہد 1959-60 کے بعد شروع ہوتا ہے۔ 1970 کے بعد تقریباً دو دہائی تک ایک سناٹا رہتا ہے لیکن پھر ''دوگز زمین'' کی اشاعت نے ناول کو مرکزی صنف بنا دیا۔ شاید ہم عصر ناول نگار اردو ناول کے لیے کوئی دوسرا عہدِ زرّیں تیار کر رہے ہوں۔

ناول کے طالب علم کے لیے یہ ایک ضروری سوال ہے کہ اردو میں جو ناول کا سرمایہ ہے، اس کا معیار دوسری اصناف اور خود دوسری زبانوں کے ناولوں کے تناظر میں طے کیا جائے۔ جب دنیا کے مشہور ناولوں کی صف بن رہی ہوتی ہے، اُس وقت ہمارے پاس بڑی تعداد نہیں ہوتی۔ عام طور پر 'گئودان' (پریم چند)، 'آگ کا دریا' (قرۃ العین حیدر) اور 'اداس نسلیں' (عبداللہ حسین) ناولوں کو صفِ اوّل میں جگہ دی جاتی ہے۔ یہ تینوں ناول نگار اردو ادب میں اُسی طرح ممتاز ہیں جیسے دنیا کے ناول نگاروں کی صف بندی میں لیو ٹالسٹائے، دوستوئیفسکی، جیمس جوائس، تھامس ہارڈی، جین آسٹن، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، جارج آرویل وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو کے مذکورہ تینوں ناول اگر شہکار ہیں تو اس کی وجہ اُن کا نظریۂ کائنات ہے۔ ناول کو جب معاشرتی دنیا کا رزمیہ کہتے ہیں تو اُس کی عظمت کے تعین میں بھی وسعت اور ہمہ گیری کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ 'گئودان'، 'آگ کا دریا'، اور 'اداس نسلیں' عظیم ناول اس لیے بھی ہیں کہ ان میں ہندستانی سماج اپنی گہرائی اور ہمہ رنگی اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان ناولوں میں واقعات کی کھتونی نہیں۔ ناول نگاروں کو معلوم ہے کہ تاریخ، تہذیب یا ملک ناول کا پس منظر ہیں۔ اسٹیج پر جو قصہ چل رہا ہے، وہ ہم عصر انسانی شیبوں سے مکمل ہو رہا ہے۔ لیکن پس منظر سے رہ رہ کر جو ایک کرن ابھرتی ہے تو ناول کا قصہ ہزار رنگوں سے بھر جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ناول نگاری کے لیے موافق حالات پیدا ہوئے۔ سائنس اور تکنیک کی برق رفتاری نے زندگی کی رفتار بڑھا دی ہے۔ 'دوگز زمین' سے لے کر 'خس و خاشاک زمانے' تک پانچ درجن سے زیادہ ناول اردو میں آئے جن کی نوعیتیں جدا جدا ہیں۔ معاشرتی مسائل سے لے کر طلسماتی دنیا تک اِن ناولوں میں زندگی کی واقعتاً ہمہ رنگ عکاسی ملتی ہے۔ عام طور سے ناول نگاروں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ زندگی کی گہما گہمی اور بوقلمونی کو اپنی تخلیق کا لازمی حصہ بنالیں۔ ہم عصر ناول نگاروں نے بلاشبہ اس میں کامیابی پائی ہے۔ تو پھر کوئی بڑا ناول کیوں نہیں سامنے آیا۔ ہوری، گوتم یا نعیم کی طرح بھرپور انسانی زندگیاں ہمارے ناولوں سے کیسے معدوم ہوگئیں۔ ہمارے پچھلے بڑے ناول اپنے عہد کا متبادل بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں 1936 سے پہلے کے ہندستان کی دیہی زندگی کی تاریخ جاننے کی خواہش ہو تو 'گئودان' پڑھ لیجیے۔ کیا 'دوگز زمین'، 'فسوں' یا 'فرات' پڑھ کر اس میں موجود عہد کا مکمل گوشوارہ دستیاب ہو سکتا ہے؟ غضنفر نے 'فسوں' میں ایک تعلیمی ادارے سے متعلق افراد کے زوال کو قلم بند کرنا چاہا لیکن کیا ہوری کی طرح وہ انسانی سوز سے لبالب کسی کردار کو خلق کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ نہیں۔ الیاس احمد گدی نے کویلری کی زندگی اور سیاست کو موضوع بنایا لیکن ایسا لگتا ہے کہ 'فائر ایریا' ابتدائی صفحات کے بعد تخلیقی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ بقیہ صفحات محض قصے کی تکمیل ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاروں کے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس کا ذہن مشرق و مغرب کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے آنگن میں موجود روایت کے ایک ایک پہلو پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔ ناول میں صرف زیادہ صفحات نہیں چاہیے بلکہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in) Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

زندگی کی وہ گہری اور سچی ترجمانی بھی لازمی ہے جس کے بغیر بڑا ادب نہیں لکھا جا سکتا۔ زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی اور نقطۂ نظر کی وضاحت اور گہرائی کے بغیر بڑا ناول نہیں لکھا جا سکتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ لکھنے والے کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ تاریخی واقعہ نہیں لکھ رہا بلکہ ایک فنی شہکار بھی تیار کر رہا ہے۔ ابھی اردو کے ادبی منظر نامے پر ناول نگاروں کی بھیڑ تو ہے لیکن اُن میں سے کوئی عظیم یا لافانی ناول عطا کر پائے گا، اس پر یقین نہیں ہوتا۔

مختصر گفتگو

۱۔ اردو ناول کن اسباب سے وجود میں آیا؟

۲۔ درج ذیل ناولوں کے مصنفین کے نام لکھیے :

ابن الوقت، صورۃ الخیال، مجالس النسا، اصلاح النسا، فسانۂ آزاد، حاجی بغلول۔

۳۔ پریم چند کے پانچ اہم ناولوں کے نام لکھیے۔

۴۔ قرۃ العین حیدر کے چھے ناولوں کے نام تحریر کیجیے۔

۵۔ ناول 'مکان' کا موضوع کیا ہے؟

۶۔ تین ویسے افسانہ نگاروں کے نام لکھیے جنھوں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی؟ ان مصنفین کے دو دو ناولوں کے نام بھی لکھیں۔

۷۔ اردو کے تین سب سے اہم ناولوں اور ان کے مصنفین کے نام لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ 'امراؤ جان ادا' سے قبل لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ ''امراؤ جان ادا اردو ناول کی تاریخ میں سنگِ میل ہے۔'' اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔

۳۔ ''اردو ناولوں میں ظرافت'' ——— اس عنوان پر ایک مختصر مضمون لکھیں۔

۴۔ پریم چند کی ناول نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

۵۔ ترقی پسند ناول نگاری کی خصوصیات واضح کریں۔

۶۔ قرۃ العین حیدر کے ناول سابقین کی تحریروں سے علاحدہ انداز کے حامل ہیں۔ کیسے؟

۷۔ دورِ حاضر کے ناولوں کا جائزہ لیجیے۔

۸۔ آج عظیم ناول کیوں نہیں لکھے جا رہے ہیں؟ اسباب بتائیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

مختصر افسانہ

مختصر افسانے کو زندگی کی ایک قاش کہا گیا ہے۔ طول طویل انسانی زندگی کے کسی خاص موڑ یا مخصوص واقعے کو تخلیق کار اپنی فکر کا حصہ بناتا ہے۔ زندگی شرح وبسط کے ساتھ مختصر افسانوں میں جگہ نہیں پاتی بلکہ ایک اجمالی تاثر کارفرما ہوتا ہے۔ مغرب سے جن اصناف کو اہل اردو نے لاکر پھلنے پھولنے کا موقع دیا، اُس میں مختصر افسانے کی سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ اس صنف کو بڑی تعداد میں لکھنے والے ملے اور مقبولیت کے اعتبار سے اِسے اور زیادہ اعتبار حاصل ہوا۔ جتنی کم عمر اس صنف کی ہے، اُس کے مقابلے میں اس کا سرمایہ، معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے وزنی تسلیم کیا جائے گا۔

فکشن کی دوسری اصناف کی طرح مختصر افسانے میں بھی قصہ گوئی ایک لازمی عنصر ہے۔ داستان اور ناول کی طرح یہاں افسانہ نگار قصہ گوئی کے آداب استعمال میں لائے تو افسانہ بگڑ جائے گا۔ مختصر افسانے کے فن کا یہ تقاضا ہے کہ قصے کو اجمال میں رہنے دیا جائے۔ اُس کے واقعات اور کردار ناول اور داستانوں کی طرح آزادی کے ساتھ اپنا رخ نہیں موڑیں۔ افسانے میں لکھنے والے کا دھیان صرف اُسی قصے پر ہوتا ہے جسے اُس نے مرکزیت عطا کی۔ ضمنی قصوں اور قصے کے درمیان سے قصہ نکلنے کے لیے یہاں کوئی مہلت نہیں ہے۔ اِسی لیے مختصر افسانے میں سب سے گٹھا ہوا پلاٹ موجود ہوتا ہے۔ بعض نقاد غزل کے اشعار سے افسانے کو جوڑتے ہیں کہ چول سے چول بٹھانا فن کار کا فریضہ ہے۔ جب قصے پر اتنی سختی ہو، اُس وقت کرداروں کے تعلق سے بھی زیادہ آزادی میسّر نہیں آئے گی۔ افسانہ نگار اگر چاہے تب بھی مکالمات کی رنگ برنگی دنیا نہیں سجا سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ افسانہ نگار کے پاس زندگی کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں لیکن ناول کی طرح اُسے آزادی نہیں ملی ہے۔ اُسے اپنے تاثرات، مشاہدات، افکار اور نظریات سب بس اشاروں میں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اتنی قید و بند میں فکشن کا جو کارنامہ تیار ہوتا ہے، اُسے مختصر افسانہ کہتے ہیں اور اسی لیے بعض نقادوں نے یہ اعلان کیا کہ مختصر افسانہ چاول پر 'قُلْ ھُوَ اللّٰہ' لکھنے کا فن ہے۔

فنی اعتبار سے مختصر افسانے میں ڈرامے کی طرح نقطۂ عروج کی بڑی اہمیت ہے۔ ناول یا داستان کسی خاص موڑ پر بہت چونکا دے، یہ ضروری نہیں۔ لیکن افسانے میں چونکانے کی کیفیت یا کسی مخصوص موڑ پر ختمِ سفر کا اعلان لازمی شے ہے۔ اشارہ غزل کی طرح افسانے کا وصفِ خاص ہے۔ افسانے کے اختصار سے یہ سمجھنا کہ ناول کے مقابلے اِس کی دنیا اور زندگی محدود ہے، صحیح نہیں ہے۔ مصوری کا نمونہ ایک ہتھیلی کے برابر جگہ پر ہو یا سو فٹ لمبائی کا کینوس ہو، اس کے معیار کا تعیّن طوالت یا اختصار سے متعیّن ہوگا؟ تاج محل کا حسن اور ایک گلاب کی خوب صورتی دونوں کے مقابلے میں رقبہ کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

اسی لیے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ناول کے مقابلے زندگی کی ترجمانی کا فن مختصر افسانہ ہے۔ کئی مختصر افسانے ہیں جنھیں پھیلا کر ناول یا پوری فیچر فلم بنانے میں فن کاروں نے کامیابی پائی اور کئی ایسے ناول ہیں جنھیں ماہرین نے مختصر کر کے پیش کر دیا۔ اس کے باوجود مختصر افسانے کی قوت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ تاثر کے اعتبار سے تو یہ صنف بے مثال ہے کیوں کہ کبھی چند صفحات کا کوئی افسانہ طول طویل ناولوں کے مقابلے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ پریم چند کے افسانے ''عیدگاہ''، ''دوبیل''، ''کفن''، منٹو کے ''کالی شلوار''، ''کھول دو'' یا بیدی کی تخلیق ''لاجونتی'' ـــــ سب بہت مختصر ہیں۔ لیکن اردو افسانے کی تاریخ میں ان افسانوں پر نہ جانے کتنے صفحات صرف ہوئے ہیں۔

اردو میں افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اردو کے اوّلین لکھنے والوں میں ابتدائی تین مصنفین کا ذکر ہوتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم، پریم چند اور علی محمود ـــــ اردو کے اوّلین تین افسانہ نگار ہیں۔ ایک زمانے تک پریم چند کے افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ افسانہ 1907 میں رسالہ ''زمانہ'' میں شائع ہوا۔ یہ اطلاع خود پریم چند نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے دی تھی۔ بعد میں 'مانک ٹالا' نے اپنی تحقیق سے بتایا کہ زمانہ میں 1907 میں پریم چند کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ ایک عرصے تک 1900 میں رسالہ ''معارف'' علی گڑھ میں شائع سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو پریم چند سے پہلے کا افسانہ اور اردو کا پہلا افسانہ مانا گیا لیکن ایک مسئلہ یہاں بھی ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں اکثر و بیش تر ترکی سے اخذ شدہ یا ترجمہ ہیں۔ عام طور پر اب یہ مانا جانے لگا ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کا یہ افسانہ اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ اُسی سال یلدرم کی تخلیق ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' بھی چھپی۔ جسے قرۃ العین حیدر اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کرتی ہیں۔ یلدرم کے یہاں انشائی عناصر افسانے کی تعمیر میں حائل ہیں۔ 1904 کے رسالہ 'مخزن' کے جنوری اور اپریل کے شماروں میں علی محمود کے افسانے ''چھاؤ'' اور ''ایک پرانی دیوار'' شائع ہوئے۔ بعض ناقدین ان تخلیقات کو اردو کے اوّلین طبع زاد افسانوں میں شمار کرتے ہیں حالاں کہ ان تحریروں میں مضمون اور انشائیے کا انداز موجود ہے۔ ظاہر ہے پریم چند 1904 میں کچھ بھی نہیں لکھ سکے تھے اور یلدرم کی ابتدائی تحریروں کو حتمی طور پر طبع زاد کہنا مشکل ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ علی محمود کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا جائے۔ بعد میں علی محمود کی تحریریں قابل اعتنا نہیں قرار دی گئیں۔ اس وجہ سے ان کی اوّلیت سے بھی صرفِ نظر ہوا۔ ادب کی تاریخ کے طالب علم کے طور پر یہ بات زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے کہ یلدرم، پریم چند اور علی محمود تینوں کو اردو افسانے کی عمارت قائم کرنے والوں میں مشترکہ اہمیت دی جائے۔

اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں اولاً سب سے زیادہ شہرت سجاد حیدر یلدرم کی ہے۔ ''خیالستان'' کے افسانے اپنے پُر اثر اسلوب اور نشاطیہ رنگ کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ ابھی فکشن کی سب سے موزوں زبان کون سی ہو اور انشا پردازی کے مقابلے افسانوی ادب کے لیے کسی دوسری زبان یا انداز کا خاکہ اُس وقت تک تیار نہیں ہوا تھا۔ جس کے سبب انشا پردازی کی اہمیت زیادہ تھی اور نثر نگار، نثر کا بنیادی جوہر وضاحت اور صراحت کے مقابلے انشا پردازی کو تسلیم کیے بیٹھے تھے۔ سرسیّد کے اثرات نثر پر ضرور واضح تھے لیکن فکشن کی فطری زبان کی تلاش کا کام ابھی باقی تھا۔ بلاشبہ سجاد حیدر یلدرم اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے اہل

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

نہیں تھے۔ اس لیے بہترین انشا پرداز ہونے کے باوجود اُن کی نگارشات کو تاریخ ادب اردو میں اہم افسانوں کے طور پر کبھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ پریم چند کے اُبھرنے سے پہلے سجاد حیدر کی ادبی شہرت قائم ہو چکی تھی اور تاریخ وار مطالعہ کریں تو یہ اندازہ ہوگا کہ سجاد حیدر کے اثرات ہم عصر ادبی فضا پر زیادہ تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو رومانی دبستان کے لکھنے والے افسانہ نگاروں کی ایک مختصر فوج بھلا کیسے افسانے کی بزم میں آپاتی۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں کا سلسلۂ نسب یقینی طور پر یلدرم سے ملتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ تھوڑے وقفے کے بعد مجنوں گورکھ پوری، میرزا ادیب، قاضی عبدالغفار، حجاب اسماعیل جیسے افسانہ نگار ابھرے جنھیں رومانی دبستان کا فن کار کہا جاسکتا ہے۔ اور جن کی پشت پر یلدرم کے واضح اثرات تھے۔ اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یلدرم سے حجاب اسماعیل تک رومانی نثر نگاری اور انشا کی بنیاد پر افسانوں کو قائم کرنے کا جو تجربہ ہوا، وہ دائمی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اردو کے رومانی افسانوں کو تاریخی اعتبار سے ہم اہمیت دے سکتے ہیں لیکن پریم چند کی رہنمائی میں جو نیا فکشن تیار ہوا، اُس کے مقابلے رومانی دبستان کی اہمیت برائے نام ہے۔

اردو مختصر افسانے کی یہ خوش بختی ہے کہ بالکل ابتدائی زمانے میں ہی اُسے وہ فن کار میسّر آیا جو اُس صنف کا ایک صدی کے بعد بھی سب سے بڑا لکھنے والا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی کُل مدت تیس برس سے کم ہے اور اردو ہندی میں تین سو سے زیادہ اُن کے افسانے شائع ہوئے۔ پریم چند کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو موزوں تکنیک، موزوں زبان اور حدود اربعہ سے آشنا کرایا۔ اُن کے بعد یہ سب کو معلوم تھا کہ افسانہ نگاری کے اصول کیا ہیں، پلاٹ کا ماڈل کیا ہوگا اور مضمون کی زبان اور فکشن کی زبان میں کون سا بنیادی فرق ہے۔ افسانہ بامقصد ہوتے ہوئے بھی کیسے مضمون یا فلسفے سے علاحدہ ہے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات سے یہ واضح کر دیا کہ افسانہ نگاری کا آیندہ سفر کس طرح ہوگا اور کون سے راستے کی طرف بڑھنا مناسب ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نثر کا وہ تصور پیش کیا جو اب سے پہلے کسی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس لیے پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اہم افسانہ نگار تو ہیں ہی، اُن کے اثرات ہمہ جہت اور دور رس رہے۔ یہ کہنا شاید بہت مشکل ہے کہ آج کا افسانہ پریم چند کے اثرات سے خالی ہے۔

1936 میں پریم چند کا انتقال اور ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑتی ہے۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ایک مستقل ٹیم ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہندستان کے نئے ماحول اور بدلتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت سامنے آچکی ہے جس کا ایک سرا پریم چند سے ملتا ہے اور دوسرا سرا اس عہد کے عالمی ماحول اور جدید تعلیم سے جڑا ہوا ہے۔ 1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت نے اردو افسانے کا ایک نیا مورچہ قائم کیا۔ سجاد ظہیر کے تین ساتھیوں ـــــ احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ سجاد ظہیر نے خود اپنے پانچ افسانے یہاں پیش کیے۔ نو افسانے اور ایک ڈرامے کی یہ کتاب قدامت اور جدت کے دوراہے پر کھڑے ہندستانی سماج پر کاری ضرب ثابت ہوئی۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے دنیا کیسے بدل رہی ہے اور خاص طور سے عورت اور مرد کی زندگیوں میں کون سی تبدیلی ہو رہی ہے، اس کا بہترین اشاریہ یہ کتاب ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ ہم سمجھتے رہیں کہ اس وقت ہندستانی سماج کا واحد موضوع جدّ وجہدِ آزادی ہے۔ غلامی سے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

نجات چاہے لیکن انسان کئی اور طرح کی غلامیوں میں بھی جکڑا ہوا تھا۔ چھوا چھوت بھی ایک غلامی تھی۔ اسی طرح عورت اور مرد کی غیر برابری بھی ایک غلامی تھی۔ 'انگارے' کے مصنفین نے اس غلامی سے اپنے افسانے میں مقابلہ کرنا چاہا۔ نتیجہ صاف تھا، یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ نوجوان لکھنے والے بڑی مشکل سے مقدمہ جیت کر اپنی سماجی آبرو قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ لیکن یہ مختصر سی کتاب اردو افسانے کا ایسا Turning Point ہے جہاں سے افسانے بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ 36-1932 کے دوران پریم چند کی بعض ایسی کہانیاں بھی شائع ہوئیں جن میں پریم چند عورت اور مرد کے رشتے پر دوسرے انداز میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ناقدین کا اصرار ہے کہ پریم چند پر اپنے سے آدھی عمر کے نوجوان مصنفین کا یہ واضح اثر ہے۔

پریم چند اور ''انگارے'' ترقی پسند افسانہ نگاروں کے لیے دو روایتیں تھیں۔ 1936 کے بعد کے اردو افسانے پر دونوں دبستان اپنے واضح اثرات کے ساتھ ترقی پسندی کی تعمیر و تشکیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی سب سے طاقت ور نسل کی نمایندگی اُن چار لکھنے والوں نے کی جنھیں پریم چند کے بعد اردو افسانے کی سب سے معتبر آواز مانا گیا۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی اردو افسانے میں اپنی آزادانہ شناخت قائم کرتے ہیں۔ 1936 سے 1950 کے درمیان ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی وہ دنیا بدل دی جو پریم چند کی روایت سے قائم ہوئی تھی۔ اب ہندستان شہروں کی طرف بڑھ رہا تھا اور افسانے کا فن بھی زیادہ گہرائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ حقیقت نگاری کے تصورات بدل گئے تھے اور عصری زندگی نئے رنگ میں ڈھلنا چاہتی تھی۔ اِن چاروں لکھنے والوں کے ہاں افسانے کے فن اور موضوعات کے اعتبار سے زبردست پختگی اور فروغ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کرشن چندر اپنے بہترین انشا اور ترقی پسندانہ موضوعات کی ترسیل، سعادت حسن منٹو شفاف حقیقت نگاری، تحلیلِ نفسی اور افسانے کی موزوں ترین زبان کے سبب تاریخی اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے دروں بینی اور نفسیاتی اعتبار سے پیچ در پیچ مقاصدِ حیات پر نگاہ رکھی اور عصمت چغتائی نے مسلمان گھروں کی عورتوں کی زندگی کو موضوع بنا کر ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا۔

اس دوران ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ایک پوری فوج سامنے آ چکی تھی۔ احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، اپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، اعظم کریوی، علی عباس حسینی جیسے افسانہ نگار بڑی تعداد میں بہترین افسانے لکھ رہے تھے۔ 60-1930 کے درمیان اردو کے افسانوی سرمائے پر غور کریں تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس سے زیادہ بڑے افسانہ نگاروں اور بہترین افسانے لکھنے کا دور کبھی نہیں آیا۔ اردو کے لازوال افسانوں کی فہرست بنائیں تو اس میں سب سے زیادہ اسی دور کے افسانے شامل رہیں گے۔ اس اعتبار سے ترقی پسند افسانوں کے اس دور کو اردو افسانے کا عہدِ زرّیں کہا جا سکتا ہے۔ اس نسل کی ایک اور بڑی طاقت یہ ہے کہ فوری طور پر دوسری اور تیسری نسل سرگرمی کے ساتھ افسانے لکھتی رہی۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، رتن سنگھ، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور جیسے افسانہ نگار ترقی پسند عہد کے دورِ دوم کی یادگار ہیں۔ اِن سب کی تخلیقی سرگرمیوں نے اردو فکشن بالخصوص افسانہ نگاری کو مقامِ استناد تک پہنچایا۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

آزادی کے فوراً بعد ملک میں جو قتل و غارت گری کا ماحول پیدا ہوا؛ اُس نے اردو ادب پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ ادب صالح انسانی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔ فسادات اور خوں ریزی کے خلاف جو جنگی سطح پر مہم شروع ہوئی، اُس میں اردو کے افسانہ نگاروں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ قتل و خون کے خلاف یہ کسی زبان یا اُس کے ادب کی جانب سے صدائے احتجاج تھی۔ جدید ہندستانی ادب کے تاریخ نویس اِس بات سے متفق ہیں کہ تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں جتنے کامیاب اور پُر اثر افسانے اردو میں لکھے گئے ہیں، شاید ہی کسی دوسری زبان میں ایسا ہوا ہو۔ کرشن چندر نے نہ صرف ''پشاور اکسپریس'' جیسی فنی اعتبار سے کامیاب کہانی لکھی بلکہ ''ہم وحشی ہیں'' عنوان سے ایسے افسانوں کا مکمل انتخاب بھی شائع کر دیا۔ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''موذیل'' افسانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ بیدی کی ''لاجونتی''، خواجہ احمد عباس کا ''میری موت''، قدرت اللہ شہاب کا ''یاخدا'' ایسے افسانے ہیں جن کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آج ہندستان کے کسی گوشے میں کسی زبان میں فسادات کے المیوں کے سلسلے سے جب بھی چند افسانوں کی بات ہوگی، اردو اُس میں صفِ اوّل میں جگہ پائے گی۔

ترقی پسند افسانوں کے بہترین دور کے بعد جدید افسانے کی باری آئی۔ غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج مین را میں سے اکثر 1950 کے آس پاس افسانے لکھنے لگے تھے اور تھوڑی مدّت تک ترقی پسند افسانہ نگار کے طور پر اُن کی پہچان بھی ہوئی لیکن 1950 کے بعد ترقی پسندوں کے بیچ سے ایک نا مطمئن طبقہ ابھرنے لگا۔ قرۃ العین حیدر کو بھی اُس وقت ترقی پسند اپنی محفل سے باہر کر رہے تھے۔ عصمت چغتائی نے کبھی ''پوم پوم ڈارلنگ'' لکھ کر قرۃ العین حیدر کو غیر ترقی پسند ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سردار جعفری اور دوسرے ناقدین اور تنظیم کار، خود عصمت چغتائی میں زوال پسندی کے رنگ دیکھ رہے تھے۔ اس ماحول میں نئے لکھنے والے ترقی پسندوں سے دور بھاگنے میں ہی عافیت محسوس کر سکتے تھے۔ دنیا کی سطح پر بھی شعر و ادب کے انداز بدل رہے تھے۔ اِسی مرحلے میں اردو کا نیا افسانہ خلق ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانوں سے نیا افسانہ ان معنوں میں پورے طور پر الگ ہے کہ یہاں صراحت کی جگہ اشارے، سادہ پلاٹ کی جگہ پُر پیچ پلاٹ، عوامی اور اجتماعی موضوعات کی جگہ انفرادی زندگی کے مسائل سے متعلق مباحث بھی آزمائے جانے لگے۔ افسانے میں علامات اور استعارے کا دخل بڑھا۔ افسانے کی فضا تجریدی ہونے لگی۔ شفیع جاوید، احمد یوسف، احمد ہمیش، خالدہ حسین، کمار پاشی، بلراج کومل، حمید سہروردی، کلام حیدری، انور عظیم، الیاس احمد گدی جیسے افسانہ نگار ترقی پسند افسانے کے بعد نئے افسانے کے خال و خط سنوارنے میں سرگرم ہوئے۔

تھوڑے وقفے کے بعد 1970 کے آس پاس ایک اور نسل سامنے آئی جس میں سلام بن رزّاق، شوکت حیات، حسین الحق، ساجد رشید، طارق چھتاری، غضنفر، سیّد محمد اشرف، عبد الصمد، شفق، انور خاں، انور قمر، انجم عثمانی، نیر مسعود جیسے اہم افسانہ نگار سامنے آئے۔ جدید افسانے کی پہلی نسل کے مقابلے اُن کے یہاں صورت میں کچھ احتیاط پسندی تھی۔ خاص طور پر 1970 کے بعد کے افسانے الگ رنگ ڈھنگ کے تھے۔ جدید افسانہ نگاروں کی دونوں نسلوں کے مشترکہ سرمائے کو دھیان میں رکھیں تو یہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اردو افسانہ ترقی پسندوں کے بنائے نشانے سے آگے بڑھا۔ خاص طور پر منٹو، بیدی،

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions Empowering Technologies

کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے جو معیار اور قبولیت کے پیمانے وضع کیے تھے، اُن تک جدید افسانہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس بیچ علامت اور تجرید کی وجہ سے اردو کے رسائل میں شائع شدہ افسانے مقبولیت سے دور چلے گئے۔ کہتے ہیں، جدیدیت کے عہد میں فکشن سب سے نامقبول حوالہ بنا۔

1980 کے آس پاس اردو افسانے پر جدیدیت کا جبر کم ہوا۔ اس دوران کئی ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جنھوں نے افسانے میں کہانی پن اور روایتی بیانیہ کی بازیافت کی۔ اس دور میں پھر سے افسانے میں قصے پن کو اہمیت حاصل ہوئی اور افسانہ جو سمجھ میں آسکے اور آسانی سے قاری تک جس کی رسائی ہو سکے، اُس پر پھر سے یقین ہونے لگا۔ بعض ناقدینِ ادب 1980 کے بعد کے افسانے کو مابعد جدیدیت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مشرّف عالم ذوقی، صغیر رحمانی، خورشید اکرم، قاسم خورشید، رحمان شاہی، شاہد اختر، اختر واصف، شموئل احمد، سہیل وحید، غزال ضیغم، تبسم فاطمہ، ترنّم ریاض وغیرہ اس نسل میں متواتر افسانے لکھنے والے افراد ہیں۔ 1980 کے بعد جدید افسانہ نگاروں کی دونوں نسلوں نے اپنے بدلے ہوئے مزاج کے ساتھ افسانے پیش کیے۔ اس لیے 1960 کے زمانے کے اقبال مجید یا 1970 کے زمانے کے شوکت حیات کا 1980 کے بعد انداز بالکل بدل جاتا ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ 1980 کے بعد جدید افسانے کی مابعد جدید افسانہ نگاروں کی رہ نمائی میں کایا کلپ ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں 1960، 1970، 1980، تینوں زمانے کے افسانہ نگار بے حد سرگرمی کے ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے عہد سے لے کر آج تک اردو افسانہ اپنے عہد کی سب سے مقبول نثری صنف کے طور پر قائم رہا۔ ایک صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود اس کی مقبولیت میں کچھ خاص کمی دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ افسانے میں وہ کون سا جوہر تھا کہ ہر عہد میں یہاں تازگی اور تابندگی کے عناصر دیکھنے کو ملے۔ افسانے میں کئی ایسی باتیں دیکھنے کو ملیں جو دوسری صنفوں کے مقابلے زیادہ موثر انداز میں موجود تھیں۔ یہ سچائی ہے کہ ہم عصر فضا کو ان دیکھا کر کے کوئی ادبی تخلیق شہہ پارہ نہیں بن سکتی لیکن بدلتے وقت کے حرکات و سکنات اور آہٹوں کو سمجھ کر وقت سے پہلے خود کو بدل لینا دور اندیش اور آگے بڑھنے والے آدمی کا کام ہوتا ہے۔ غزل اور افسانے میں تبدیلیوں کو انگیز کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رہی ہے۔ تکنیک کی سطح پر بھی بار بار بدلاؤ آئے۔ افسانوں کو یہ فائدہ ہوا کہ ایک وقت میں کئی دھارے موجود تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ گانو کی کہانیاں سب لکھ رہے تھے یا علامتوں کو اردو کے تمام افسانہ نگاروں نے اپنا تاج بنا لیا تھا یا عورت اور مرد کے تعلقات پر ہی سارے افسانہ نگار مشق فرما رہے تھے۔ اس لیے اگر پریم چند ہیں تو اُن کے عہد میں یلدرم کی انشا پردازی بھی ہے اور انگارے کا باغیانہ روّیہ بھی۔ جب علامتوں کا زور بڑھا، اس عہد میں بھی ٹھیٹھ گانو کی کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگاروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ یہ رنگا رنگی اور ہمہ جہتی اردو افسانے کی زندگی کو استحکام بخشنے میں بہت معاون رہی۔ افسانے کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مشینی عہد میں قصہ گوئی کی اس سے مختصر کوئی اور شاخ نہیں۔

مختصر صنفوں کو عملی طور پر یہ فائدہ ملتا ہے کہ اُن کے قارئین یا سامعین کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ مثنویوں کے مقابلے غزل کو یہ فائدہ ملا۔ ایک شعر سنا کر غزل کا شاعر اپنی بات پہنچا سکتا ہے۔ ادیبوں، شاعروں کو جو سماجی مواقع ملتے ہیں، اُن

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

میں نثر کے مقابلے شاعری کو یہ فائدہ ملتا ہے۔ نثر کے ارتقا کے ساتھ جب نثری محفلوں کے مواقع پیدا ہوئے تو سب سے زیادہ افسانوی محفلوں کو فروغ حاصل ہوا۔ جتنے وقت میں ایک شاعر تین چار نظمیں اور چند غزلیں سناتا ہے، اُسی وقت میں ایک افسانہ نگار اپنا افسانہ پیش کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے افسانوں کی مقبولیت بڑھ گئی۔ جس طرح کسی سلگتے ہوئے موضوع پر شاعر ایک شعر کہہ کر داد وصول کر لیتا ہے، اُسی طرح افسانہ نگار بھی مختلف مواقع سے اپنی اس مہارت کا استعمال کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بھی افسانوں کو توجہ سے پڑھا گیا۔ ناول اور داستانوں میں اس کی گنجایش کم سے کم ہے کہ کسی مختصر یا ہنگامی موضوع پر لکھنے والا اپنے تبصرے پر مائل اور پڑھنے والے اُسی ارتکاز کے ساتھ اُس پر غور کر سکیں۔ اِس لیے داستان یا ناول اپنی دوسری خصوصیات کی وجہ سے اہمیت حاصل کرتے ہیں۔

اردو افسانے کی عمر ایک صدی سے زیادہ نہیں۔ شعر و ادب کی تاریخ میں اسے ایک مختصر میعاد کہتے ہیں لیکن اس صنف کی مقبولیت اور اردو میں موجود سرمائے کو دھیان میں رکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہزار برسوں سے زیادہ اس صنف کی عمر ہو گئی۔ غزل کی طویل تاریخ ہے اور ہم میر، غالب کے بعد معیار کے اعتبار سے فہرست میں اگلا نام پیش کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایک سو سال کی صنف ہونے کے باوجود پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے نام ذہن پر زور دیے بغیر آ جاتے ہیں۔ مثنویوں کا سفر پانچ سو سال سے زیادہ کا ہے۔ ملا وجہی، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے آگے لب نہیں کھلتے۔ قصیدے میں سودا اور ذوق کے بعد فہرست نگار خاتمے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ مرثیے میں انیس اور دبیر کے بعد زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ناول میں پریم چند، قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے بعد اتنا بڑا کون ہے۔ یہ تفصیل واضح کرتی ہے کہ افسانے میں لکھنے والوں کی ایک فوج سامنے آئی اور معیاری یا شہ کار تخلیق کرنے والے صفِ اوّل کے اہلِ قلم بڑی تعداد میں اس صنف کی طرف پُرکشش انداز میں دیکھتے رہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ مختصر افسانے کے جنم نے اردو کی ادبی محفل میں وہ طوفان کھڑا کیا جس کے مقابل کم اصناف ٹھہر پائیں۔ سب سے زیادہ تیز روی اسی صنف نے دکھائی۔ اِسی وجہ سے مختصر افسانے نے مقبولیت اور پایۂ اعتبار دونوں حاصل کیا۔ آنے والے وقت میں زندگی کی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر برتنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے بہترین ناول نگاری کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن زمانے کی برق رفتاری اور رفتہ رفتہ آدمی کے پاس وقت کے سمٹتے منظروں کے سبب غزل اور مختصر افسانے سے قربت رکھنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ افسانہ مؤثر اور شفاف انداز میں آیندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

مختصر گفتگو

۱۔ ''مختصر افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے'' واضح کیجیے۔
۲۔ ''مختصر افسانہ'' کے اجزائے ترکیبی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
۳۔ مجموعہ ''انگارے'' کب شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مصنفین کے نام لکھیے۔
۴۔ اردو کے دس ترقی پسند فسانہ نگاروں کے نام بتائیے۔
۵۔ اردو کی پانچ خواتین افسانہ نگاروں کے نام قلم بند کیجیے۔
۶۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی کے تین تین افسانوں کے عنوانات لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار کس تخلیق کار کو کہا جا سکتا ہے؟ مدلل لکھیے۔
۲۔ پریم چند کے افسانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
۳۔ ''ترقی پسند افسانہ نگاری'' کے موضوع پر ایک مضمون قلم بند کریں۔
۴۔ فسادات کے موضوع پر لکھے گئے چند افسانوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔
۵۔ 1980 کے آس پاس کے افسانہ نگاروں کو جدیدیت کے دور کے افسانہ نگاروں سے الگ راستہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ موجودہ دور میں سرگرم افسانہ نگاروں کے نام بھی درج کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions

HISTORY OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE

For Class XI & XII

BIHAR STATE TEXTBOOK PUBLISHING CORPORATION LTD., PATNA
बिहार स्टेट टेक्स्टबुक पब्लिशिंग कॉरपोरेशन लिमिटेड, बुद्ध मार्ग, पटना

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.abdiel.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions